ابلیس
از
نمرہ احمد
پاک سوسائٹی ڈاٹ کام
WWW.PAKSOCIETY.COM

# ابلیس

نمرہ احمد

یہ کہانی جو میں آپ کو سنانے جا رہی ہوں، یہ میری کہانی نہیں ہے بلکہ میں تو صرف اس کہانی کی ایک خاموش تماشائی ہوں۔ میرا یعنی حلیمہ داؤد کا نام تو اس داستان کے کسی پڑھنے والے کے لیے شاید یاد رکھنے کے لیے قابل نہ ہو مگر ان دو کرداروں کا ضرور جنہیں میں ان کے خوب صورت ناموں سے جانتی ہوں۔

فلزہ ابراہیم اور رضا حیات خان۔

میں نے ان دونوں کو بہت قریب سے دیکھا ہے اور ایسے دیکھا ہے جیسے کسی نے نہ دیکھا ہوگا اسی لیے آج میں ایک بات کہنے کے قابل ہوئی ہوں۔ وہ بات جس کو میں ہمیشہ جھٹلاتی تھی کہ شک کا فائدہ ہر

ایک کو نہیں دینا چاہیے۔ ہر شے کی ایک حد ہوتی ہے اور جب وہ حد پار کر لی جائے تو اس اسفل السافلین کو شک کا فائدہ نہیں دینا چاہیے۔ اصولوں پر سمجھوتے نہیں کیا کرتے اور جو یہ کرتے ہیں وہ اپنے ساتھ بہت غلط کرتے ہیں۔

ہماری یہ کہانی قریباً سال بھر پہلے سے شروع ہوئی تھی جب میں اپنے ماسٹرز کے پہلے روز سائیکالوجی کی کلاس لینے گئی تھی۔

☆☆☆

میں نے زندگی میں کبھی اتنا پن ڈراپ سائلنس نہیں دیکھا تھا جو اس روز کلاس میں چھایا تھا۔ گردنیں سحر زدہ سی اس شخص کی طرف اٹھی ہوئی تھیں جو ہمارے سائیکالوجی کے پروفیسر تھے۔ پروفیسر...... جو وہ کہیں سے نہیں لگتے تھے، میں بھی اس مسحور ہوئی اکثریت کے ساتھ تھی اور ان سب کی طرح میں بھی کچھ نہیں لکھ پا رہی تھی۔ نوٹس لینے کا ہوش ہی کسے تھا۔ وہ تھے ہی ایسے شخص کہ جن کے سامنے نگاہ ٹھہرتی نہ تھی۔

وہ روسٹرم پہ کھڑے، اپنے سنجیدہ انداز میں لیکچر دے رہے تھے۔ تیکھے نقوش، خوب صورت آنکھیں، صاف رنگت، جیل سے پیچھے کیے بال، قیمتی اور نفیس ایش گرے ٹوپیس میں ملبوس، وہ بلا کے ہینڈسم تھے۔ صرف وجاہت نہیں ایک اور کشش بھی ان کے اندر تھی جو مقابل کو اوندھے منہ گرا دیتی تھی۔ وہ کشش کیا تھی، میں اسے کوئی نام نہ دے سکی۔ بس کوئی مقناطیسی اثر تھا جو ان کے گرد پھیلا تھا اور اس مقناطیسیت سے کوئی بھی محفوظ نہیں رہا تھا۔ کلاس ختم ہوئی تو سب کے لبوں پر ایک ہی نام تھا۔ سر رضا حیات خان۔

اس روز مجھے پہلی دفعہ پروفیسر رضا کا نام معلوم ہوا تھا۔ وہ ینگ تھے، اسمارٹ تھے اور ان کی حسِ مزاح بہت زبردست تھی۔ ان کے لیکچر میں کوئی بور نہیں ہو سکتا تھا۔ کچھ ان کی شخصیت کا فسوں تھا اور کچھ کمالِ گفتار، وہ اپنے موضوع پر مکمل عبور رکھتے تھے اور وہ کبھی لاجواب نہیں ہوتے تھے۔ ان سے پوچھے جانے والے ہر سوال کا جواب سائل کو ہمیشہ بروقت ملتا تھا۔ عمر میں وہ زیادہ نہ تھے۔ ایم فل کیے ہوئے بھی انہیں زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا اور یونیورسٹی سے وہ پانچ برس سے منسلک تھے۔ ہم تو ان کے پرستار بن ہی گئے۔ ہمارے سینئرز کا تو اور برا حال تھا۔ پورے ڈیپارٹمنٹ میں اگر کسی کا چرچا تھا تو وہ سر رضا تھے۔

ان سے میرا باقاعدہ تعارف ان کی دوسری کلاس میں ہوا جب انہوں نے تمام طلبا سے اپنا نام بتانے کی درخواست کی۔ جب میری باری آئی تو میں قدرے جھجک کر کھڑی ہوئی۔ ”سر میرا نام حلیمہ داؤد ہے۔“

انہوں نے جواباً مجھے ہلکی نرم سی مسکراہٹ دی۔ میں دھڑکتے دل کے ساتھ واپس نشست پر بیٹھی۔ ان کی وہ مسکراہٹ میری متاعِ جاں بن گئی۔ وہ میرے لیے مسکرائے، میرا نام سن کر مسکرائے...... مجھے لگتا تھا میں کبھی اس لمحے سے نکل نہیں سکوں گی۔ مگر میرا دل...... ابھی اور بہت سے لمحے آنے تھے۔

☆☆☆

اس روز باہر زوروں کی بارش ہو رہی تھی اور اندر ہماری کلاس جاری تھی۔ آج وہ سائیکالوجی سے ہٹ کر بات کرنے کے موڈ میں تھے اور ہم مسحور لوگ تو بند آنکھوں ان کی پیروی کیا کرتے تھے۔

”کون بتائے گا کہ انسان کی شناخت کن چیزوں سے ہوتی ہے؟“ وہ چہرہ قدرے جھکا کر مائیک میں بولے تو بہت سے ہاتھ فضا میں بلند ہوئے۔

”انسان کی شناخت اس کے نام سے ہوتی ہے سر۔“

”اس کے ملک سے۔“

”قبیلے یا ذات سے۔“

”رسم و رواج سے۔“

”زبان سے۔“

”اس کے کردار کی خصوصیات سے۔“

”کسی اچھے یا برے کارنامے سے۔“

وہ مسکرا کر ایک ایک کی سنتے گئے۔ دفعتاً میں نے اپنا کمزور سا ہاتھ بلند کیا، جانے اتنے لوگوں میں انہیں میرا ہاتھ کہاں سے نظر آ گیا۔

”جی حلیمہ داؤد...... آپ بتائیں، انسان کی بنیادی شناخت کس شے سے ہوتی ہے؟“ بہت سی گردنیں میری جانب گھومیں، میں نے بمشکل تھوک نگلا۔ سب کے سامنے بولنا میرے لیے ہمیشہ کٹھن رہا تھا مگر پروفیسر رضا کی ہمت افزا مسکراہٹ میرے اندر نئی روح پھونک گئی۔

”د...... دین سے۔“ میں ہکلا کر بولی تو ان کے چہرے پر چمک سی آ گئی۔

”فائنلی حلیمہ نے وہ بات کہی ہے جس کے سننے کا میں منتظر تھا۔ ہم شناخت کے معاملے میں دین کو کیسے اسکیپ کر سکتے ہیں؟ دراصل یہ سوشل سائنسز کا ایک اہم سوال ہے کہ جب ہم انسانی شناخت کی بات کرتے ہیں تو دین کو کیوں بھلا دیتے ہیں؟“ وہ اپنے مخصوص پُرکشش انداز میں ہاتھ ہلا کر کہہ رہے تھے اور میں بس اس ایک فقرے پر ہی ٹھہر گئی۔

”فائنلی حلیمہ نے وہ بات کہی ہے جس کے سننے کا میں منتظر تھا۔“ باہر گرتی بارش کے قطرے میرے دل کو بھگونے لگے تھے۔ مجھے لگ رہا تھا میں ابھی رو دوں گی۔

میں وہ تھی جسے ہجوم تو کیا دو لوگوں میں بھی کھڑی ہوں تو کوئی نظر اٹھا کر نہ دیکھے۔ چہرے پر ٹرم پہنے، کڑھائی والی چادر اوڑھے، میں بے حد معمولی شکل کی لڑکی تھی..... اگر کوئی میری موجودگی کو نوٹ کرتا بھی تھا تو شاید میری..... بیساکھی کے باعث جس کے سہارے میں چلتی تھی۔ ایک حادثے میں کئی برس قبل میری دائیں ٹانگ مفلوج ہو گئی تھی اور اب میرا واحد سہارا میری بیساکھی تھی۔ ایک کم شکل، معذور لڑکی کو کسی نے لمحے بھر کو تعریفی نگاہوں سے نوازا تھا، میں خود کو بادلوں میں تیرتا محسوس کرنے لگی تھی۔

شام کو جب میں اپنے کمرے میں اکیلی بیٹھی تو خود سے باتیں کرنے لگی۔ ہر شخص خود کلامی کرتا ہے۔ جو کہتا ہے کہ وہ خود کلامی نہیں کرتا، وہ جھوٹ بولتا ہے۔ تنہائی میں، میں نے بھی اپنی ایک دنیا بسا رکھی تھی، جہاں میں معذور اور کم شکل نہ تھی۔ جہاں میری ہتک اور تذلیل نہیں ہوتی تھی اور جہاں مجھے کوئی احساسِ کمتری نہیں ہوتا تھا۔ وہاں اس دنیا میں، میں حلیمہ داؤد نہیں تھی۔ میں اینا یاور تھی۔ یہ نام بھی خود کو میں نے..... ہی دیا تھا۔ یہ نام مجھے بہت پسند تھا۔ اپنا نام بدلنے کا اختیار نہ تھا مجھے، اگر ہوتا تو بھی حلیمہ داؤد کے ساتھ میرا وجود بھی نگاہوں کے سامنے گھوم جاتا تھا اور میں خود کو کبھی اینا کا نام نہ دیتی۔

اینا بہت خوب صورت تھی، بے تحاشا امیر اور شاہی خاندان کی اکلوتی اولاد۔ باپ کے اربوں کے بزنس کی اکلوتی جانشین اور یونیورسٹی کے ہر اسٹوڈنٹ کے دل کی دھڑکن رو کنے کا سبب۔ وہ جب چلتی تھی تو لوگ سحر زدہ سے ٹھہر کر اسے دیکھتے تھے۔ اس کے حسن، ذہانت اور دولت کے قصے ہر جگہ پھیلے تھے۔ وہ راجدھانی کی شہزادی تھی اور اس جیسا کوئی نہ تھا۔

اماں کی آواز آئی تو میں چونکی پھر بیساکھی سے خود کو گھسیٹتی باہر آئی۔ اماں کی آواز یونہی اکثر میرے ارد گرد تیرتے ”اینا یاور“ کے ست رنگے بلبلے میں چھید کرا کے پھاڑ دیا کرتی تھی۔

”جی اماں!“ میں نے کچن کے کھلے دروازے

سے جھانکا۔ وہ سنک کے سامنے کھڑی برتن دھو رہی تھیں۔ آواز پر پلٹیں۔

"تمہارے ماموں آئے تھے آج پھر کرایے کا تقاضا کر رہے تھے۔ سمجھ نہیں آتا کہ کیا کروں۔" ان کے چہرے پر پریشانی رقم تھی۔

ہم جس گھر میں رہتے تھے اس کا کرایہ باقاعدگی سے ماموں کو ادا کرتے تھے کہ نانا کی ملکیت تھا اور ان کے بعد اب ماموں اس کے مالک تھے۔ اماں کی بیوگی کے آغاز کے چند برسوں میں جب میں بہت چھوٹی تھی، ماموں نے ازراہِ ہمدردی ہمیں اس گھر میں مفت رہنے دیا تھا۔ (تب وہ خود بھی ادھر ہی مقیم تھے۔ الیف سکس والے نئے گھر میں شفٹ ہوئے تو انہیں پانچ، چھ، برس ہی ہوئے تھے) بعدازاں وہ ہم سے کرایہ وصول کرنے لگے اور اب وہ ان چند سالوں کی مفت کی رہائش کا کرایہ بھی سکۂ رائج الوقت کے پیمانے پر طلب کر رہے تھے۔ ابو کی چھوڑی دو دکانوں کے کرایے سے ہمارے گھر کا خرچ، مکان کا کرایہ اور میری تعلیم کے اخراجات بہ مشکل پورے ہوتے تھے۔ اب یہ اضافی خرچ کہاں سے لاتے؟

کوئی اور دن ہوتا تو میں اماں کو تسلی دیتی مگر آج میں خود بھی خاموش ہوگئی۔ شاید میں ذہنی طور پر اماں کے پاس کچن میں تھی ہی نہیں بلکہ ابھی تک کلاس روم میں تھی۔ جہاں بارش کے تڑاتڑ گرتے قطرے بند کھڑکیوں کے شیشوں پر لڑھک رہے تھے۔ اماں کافی دیر اپنے مسائل کا رونا روتی رہیں مگر جب میں خاموشی سے خلا میں گھورتی رہی تو وہ شکست خوردہ سی اپنے کاموں کی جانب پلٹ گئیں۔

ایک روز میں کلاس کے بعد لائبریری میں بیٹھی پڑھ رہی تھی جب مجھے سامنے کھڑے بک ریک کے پیچھے سے مدھم سی آوازیں سنائی دیں۔ لاشعوری طور میں ان کی جانب متوجہ ہوگئی۔ وہ کسی اور کی نہیں بلکہ پروفیسر رضا کی ہی آواز تھی۔

"آپ روئیں مت، آپریشن ہو جائے گا، میں کہہ رہا ہوں نا کہ ہو جائے گا۔" میں نے گردن ذرا سی ترچھی کی۔ وہ بک ریک کے عقب میں کھڑے ہاتھ اٹھا کر کسی کو تسلی دے رہے تھے۔

"سر آپریشن نہیں ہو سکے گا، ڈاکٹر نے آج کی آخری تاریخ دی تھی۔ میری بہن مر جائے گی، مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہا۔" وہ رندھی آواز میں بولتا ذورین تھا۔ میرا کلاس فیلو، میں نے سنا تھا اس کی بہن کی کوئی پیچیدہ سی سرجری ہونی ہے، کبھی وقت ہی نہیں ملا کہ مزید تفصیل پوچھتی۔ ویسے بھی میں ان شریف لڑکیوں میں سے تھی جو لڑکوں سے مخاطب نہیں ہوا کرتی تھیں۔

"اچھا روم نمبر کیا ہے اس کا؟" وہ اس کے شانے پر ہاتھ رکھے اپنے ازلی نرم انداز میں پوچھنے لگے۔ ذورین نے روم نمبر بتایا اور سر جھکائے آنکھ کا کنارہ انگلی کی نوک سے پونچھا۔ میں نے دیکھا، پروفیسر کے چہرے پر سوچ کی گہری پرچھائیاں تھیں، میں دھیرے سے سر جھٹک کر پڑھنے لگی مگر اب کتاب کی طرف ذہن کہاں متوجہ ہوتا تھا۔

بہ مشکل تین دن گزرے تھے کہ مجھے ذورین کیمپس میں ایک جگہ سیڑھیوں پر بیٹھا نظر آیا۔ ساتھ اس کے دو تین دوست بھی تھے۔ اور وہ کسی بات پر ہاتھ پر ہاتھ مار کر ہنس رہے تھے۔ مجھے ذرا اچنبھا ہوا مگر خیر...... میں سر جھکائے، بیساکھی سے خود کو گھسیٹتی ان کے قریب سے گزر رہی تھی جب ذورین کے دوست کی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔

"بہت مبارک ہو ذوری، میں گھر پر آنٹی کو مبارک باد دینے بھی آؤں گا۔"

"ہاں یار! میں بتا نہیں سکتا کہ کتنا پُرسکون ہوں۔" ذورین کے چہرے پر سچی خوشی بکھری تھی۔

"ارے ہاں، کچھ پتا چلا کہ آپریشن کی پے منٹ کس نے کی تھی؟"

"نہیں...... مگر وہ جو بھی تھا، فرشتہ تھا میرے لیے، اللہ اسے اجر دے۔" اور ان سے دور جاتے ہوئے میرے لبوں سے بے اختیار نکلا تھا۔ "آمین۔" ذورین بھلے نہ جانتا ہو مگر میں جانتی تھی کہ وہ کون تھے۔

☆☆☆

کچھ بدلتے موسم کا اثر تھا اور کچھ میری نازک طبیعت، مجھے ایسے نزلے زکام نے گھیرا کہ میں تین روز تک یونیورسٹی نہ جا سکی۔ چوتھے روز جب کلاس میں گئی تو بھی زکام کی باقیات باقی تھیں۔ لیکچر کے اختتام پہ جب میں کلاس سے نکلی تو رضا حیات خان کاریڈور میں جیسے کسی کے انتظار میں کھڑے تھے۔ ایک لمحے کو مجھے اس پر رشک آیا جس کے انتظار میں وہ تھے۔ ان لمحوں کے انتظار نے اس نامعلوم شخص کو کتنا معتبر کر دیا تھا۔

"حلیمہ داؤد...... کدھر تھیں آپ؟ میں آپ کا ہی انتظار کر رہا تھا۔" میں ان کے قریب سے گزرنے لگی تو وہ مسکرا کر میری طرف بڑھے۔ میں ٹھٹک کر رک گئی۔ وہ میرا انتظار کر رہے تھے؟

"جج...... جی پروفیسر؟" میں سانس روکے انہیں دیکھے گئی۔ وہ میرے بالکل سامنے آ رکے۔ ان کے شاندار وجود سے کسی قیمتی پرفیوم کی مسحور کن مہک اٹھ رہی تھی۔

"تین دن کدھر غائب رہیں؟ میں تو پریشان ہی ہو گیا تھا۔"

"مم...... میں ذرا...... وہ فلو ہو گیا تھا۔"

"اوہ...... اپنا خیال رکھا کرو، اسٹوڈنٹ کو بیمار نہیں پڑنا چاہیے اور اتنے برائٹ اسٹوڈنٹ کو تو ہرگز نہیں۔" وہ مسکرا کر دھیمے لہجے میں کہہ کر پلٹ گئے......

اور میں حلیمہ داؤد اپنے ست رنگے بلبلے میں مقید فضا میں تیرنے لگی......

ذورین کہتا تھا کہ وہ فرشتہ ہے، مجھے لگتا تھا وہ کوئی یونانی دیوتا ہے جو آسمانوں سے اترا ہے مگر شاید وہ اس سب سے بڑھ کر کچھ اور تھے۔ وہ ساحر تھے ان کے ایک اشارے پر بل کھاتی رسیاں سانپ بن جایا کرتی تھیں اور مجھے سحر کہاں آتے تھے؟

ان دنوں مجھے لگتا تھا کہ دنیا میرے بلبلے کے آس پاس کہیں تحلیل ہو گئی ہے، سب فنا ہو چکا ہے اور

اگر کچھ باقی ہے تو میرا انتظار...... ہر روز رضا حیات خان کی کلاس کا انتظار۔ انہیں ایک نظر دیکھنے، ان کی ایک مسکراہٹ حاصل کرنے کا انتظار اور پھر کلاس کے اختتام کے بعد اگلے روز کلاس کا انتظار شروع...... کبھی وہ مجھے دیکھتے، کبھی مسکرا بھی دیتے اور کبھی وہ اپنے اردگرد لگے جمگھٹے میں اتنے مصروف ہوتے کہ انہیں میں دکھائی نہ دیتی۔ وہ دن میرے لیے بہت اذیت ناک ہوتا تھا۔ جب ان کی نگاہ میری جانب نہ اٹھتی۔ اس دن مجھے کچھ بھی اچھا نہیں لگتا۔ میں عجیب بیزاریت کی لپیٹ میں رہتی۔

وہ دسمبر کا ایک سرد دن تھا جب میں اماں کے ساتھ کسی کام سے شاہین کیمسٹ تک آئی۔ دکانوں کے سامنے سڑک پر خاصا رش تھا اور پرہجوم جگہوں پر مجھے ویسے خوف آتا تھا۔ میں اپنی بیساکھی کے سہارے خود کو گھسیٹتی فٹ پاتھ پر چلتی جارہی تھی جب مجھے سڑک کے دوسری جانب ایک منظر دکھائی دیا۔

ایک جھلک، ایک گمان...... میں چونکی۔ وہ بلاشبہ رضا حیات ہی تھے۔ اپنے مخصوص حلیے سے ہٹ کر وہ جینز اور جیکٹ میں ملبوس سڑک کے کنارے کھڑے تھے۔ ان کے ساتھ ایک بوڑھا شخص بھی تھا جو آنکھوں پر سیاہ چشمہ لگائے سفید اسٹک پکڑے، کچھ بولتا ہوا ساتھ ہی ہاتھ کے اشارے سے رضا کو کچھ سمجھا رہا تھا۔ رضا اثبات میں سر ہلاتے اسے بغور سن رہے تھے پھر وہ اس عمر رسیدہ شخص کا ہاتھ تھام کر آگے آئے اور احتیاط سے دو طرفہ بہتی ٹریفک کے درمیان سے گزرتے اسے سڑک پار کرانے لگے۔ چند ہی لمحوں بعد وہ دونوں سڑک کے اس طرف پہنچ گئے۔ بوڑھے کو نرمی سے کچھ سمجھا کر، اب وہ جانے کی اجازت مانگ رہے تھے۔ وہ عمر رسیدہ نابینا شخص دونوں ہاتھ اٹھا کر انہیں دعا دینے لگا۔ رضا بہت ممنون، بہت شرمندہ سے واپس پلٹے۔ میری نگاہوں نے اس وقت تک ان کا تعاقب کیا جب تک کہ وہ واپس اپنی کار میں نہ بیٹھ گئے پھر میں مسکرا کر ہولے سے سر جھٹک کر آگے بڑھ گئی۔

کہاں ہوتے ہیں آج کل ایسے لوگ؟

☆☆☆

''شک کا فائدہ ہر ایک کو دینا چاہیے۔ میں اس بات سے متفق نہیں ہوں۔ کیا آپ ہیں؟'' کلاس میں سکوت چھایا تھا اور وہ اپنے ازلی سحر انگیز انداز میں پوچھ رہے تھے۔ ہر ذی نفس خاموش، ساکن بیٹھا رہا کسی کو ان سے اختلاف نہیں تھا، سوائے میرے۔

''میں ہوں۔'' میں نے اپنا کمزور ہاتھ فضا میں بلند کیا۔ وہ ذرا چونکے شاید حیران ہوئے تھے۔

''حلیمہ داؤد؟'' وہ جیسے یاد کرکے بولے۔

''ہماری یہ سب سے برائٹ اسٹوڈنٹ اس بات سے کیوں متفق ہیں، ہمیں بتائیں پلیز؟''

یہ مبالغہ آرائی تھی، میں بہت ایوریج سی طالبہ تھی اور یہ بات سب جانتے تھے معلوم نہیں وہ کیوں مجھے اتنی اہمیت دیتے تھے۔ یا پھر وہی دیکھتا ہے جو وہ دیکھنا چاہتا ہے۔ مجھے لگا میں بھی وہی دیکھ رہی ہوں۔

''سر میرا خیال ہے کہ ہر شخص کو شک کا فائدہ دیا جانا چاہیے اگر آپ نے کچھ آنکھوں سے دیکھا یا نہیں دیکھا تو بھی بجائے کسی کو فوراً مورد الزام ٹھہرانے کے اسے شک کا فائدہ دے کر بری الذمہ قرار دینا چاہیے۔''

''آپ کو کیا لگتا ہے حلیمہ کہ آپ کا یہ آرگومنٹ کن جگہوں پر اپلائی ہوتا ہے؟'' ہال میں خاموشی چھائی تھی اور وہ ڈائس پہ کہنیاں رکھے پوری سنجیدگی سے میری جانب متوجہ تھے۔ اوہ خدایا، وہ کتنے ہینڈسم تھے۔

ہر اس جگہ پہ جہاں کسی انسان پر ہمیں کسی گناہ کا شک ہوتا ہے۔''

''صرف انسان؟'' وہ ہولے سے مسکرائے۔ میں رے بڑبڑائی۔

''آف کورس، ہم انسانوں کی ہی تو بات کر رہے ہیں۔''

''مگر آپ نے گناہ کا ذکر کیا تو گناہ ایک اور مخلوق سے بھی سرزد ہوتے ہیں۔'' میں الجھ کر انہیں دیکھنے لگی۔ جانور، درندے، پودے، حشرات الارض میرے ذہن کے پردے پر ایک ایک کرکے کئی نام آتے گئے۔

''جنات!'' میری خاموشی پر انہوں نے کہا تو پورے ہال میں ایک عجیب سنسنی سی دوڑ گئی۔

''جنات؟'' میں ہولے سے بڑبڑائی۔

''جی ہاں، جنات...... اور یہ جو بیک بینچرز ہیں ان کو منہ بنانے کی قطعاً ضرورت نہیں ہے، میں یہاں آپ کو کوئی ہارر اسٹوریز نہیں سنانے لگا۔'' ان کے چہرے کے تاثرات جیسے ہی سخت ہوئے آخری نشستوں پر بیٹھے سارے لڑکے تیر کی طرح سیدھے ہوئے پھر وہ میری جانب متوجہ ہوئے۔ ان کی آنکھوں میں سختی کی جگہ نرم تاثر نے لے لی۔

''تو حلیمہ داؤد اگر گناہ کی بات ہے تو کیوں نہ جنات کا ذکر کیا جائے؟'' وہ میری آنکھوں میں دیکھ کر پوچھ رہے تھے اور مجھے لگا میں نے اختلاف میں غلط بات اٹھا لی ہے۔

''ہزاروں برس پہلے ایک جن ہوا کرتا تھا، ابو الجن، جنات کا باپ۔ اس کا نام عزازیل تھا۔ وہ جنوں کا سردار تھا۔ مکرم تھا محترم تھا۔ اس سے زیادہ نیک اور پارسا کوئی نہیں تھا۔ وہ سب سے بڑا عبادت گزار تھا پھر کیا ہوا؟ آپ بتایئے حلیمہ داؤد پھر کیا ہوا اس عزازیل کو آج آپ ابلیس کے نام سے یاد کرتی ہیں؟''

میری ہتھیلیاں پسینے سے بھیگ گئیں۔





''اس نے آدمؑ کو سجدہ کرنے سے انکار کیا تھا...... یا یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ اس نے اللہ کا حکم ماننے سے انکار کیا تھا نہیں؟''

''جج...... جی۔''

''اس نے کیوں کیا وہ سب؟ کیوں وہ انسان سے حسد کا شکار ہوا؟ کیا، اس کے تکبر بھرے انکار کی کوئی وجہ ہے؟ نہیں ہرگز نہیں۔''

ہال میں سناٹا چھایا تھا۔ سب دم سادھے انہیں سن رہے تھے۔

''ابلیس نے جو بھی کیا وہ میں ہی کیا اور وہ آج بھی بہت سے انسانوں کو اپنے جیسا ''ابلیس'' صرف اس لیے بنانا چاہتا ہے کہ اللہ انسان سے محبت نہ کرے۔ آپ نے کبھی سوچا کہ شک کا فائدہ اللہ نے ابلیس کو کیوں نہیں دیا۔ باوجود اس کے کہ اللہ سے بڑھ کر مہربان کوئی نہیں ہے؟''

وہ مجھے دیکھ کر استفسار کررہے تھے اور میں بنا پلک جھپکے سانس روکے انہیں دیکھ رہی تھی۔ مجھے لگ رہا تھا میری آواز کبھی نہیں نکل پائے گی۔

''وہ اس لیے ڈیئر اسٹوڈنٹس کہ ہر شے کی ایک حد ہوتی ہے جب وہ حد پار کرلی جائے تو پھر اس شخص کو رعایت نہیں دی جاسکتی۔ بعض اصول ایسے ہوتے ہیں جن پر سمجھوتا ناممکن ہوتا ہے۔ سو اپنی زندگی میں ایسے اصول بنائیں کہ اگر کوئی انہیں توڑے تو آپ اس ابلیس کو کوئی رعایت نہ دیں۔ عزازیل ہر کوئی بن سکتا ہے مگر جو عزازیل سے ابلیس بنے وہ بندگی کی جنت سے ہمیشہ کے لیے نکال دیا جاتا ہے۔ اس کی کبھی واپسی نہیں ہوتی۔''

میں نے بے اختیار دونوں ہتھیلیاں اٹھا کر تالی میں ملائیں اور ایک دم پورا ہال تالیوں سے گونجنے لگا۔

''اوہ کم آن اسٹوڈنٹس!'' وہ جھینپ کر ٹیبل پر رکھی کتاب کی طرف متوجہ ہوگئے۔

☆☆☆

ہمارے ڈیپارٹمنٹ کے ایک بہت پرانے پروفیسر، سر عثمان راؤ ان دنوں ریٹائر ہوئے تھے۔ ان کے اعزاز میں ایک شاندار سی فیئر ویل پارٹی کا انعقاد کیا گیا تھا۔ جس پر تمام فیکلٹی ممبران اپنے ازواج کے ساتھ مدعو تھے۔ اس شام میں نے پہلی دفعہ پروفیسر رضا کی بیوی کو دیکھا۔

اس کا نام علینا تھا۔ وہ دراز قد اور بھورے گھنگرالے بالوں والی بے تحاشا حسین لڑکی تھی۔ جیسے موم کی گڑیا۔ رضا بلیک ڈنر سوٹ میں ملبوس تھے اور وہ ان کے ساتھ سیاہ اسٹائلش لباس میں پورے اعتماد کے ساتھ کھڑی بہت خوب صورت لگ رہی تھی۔ کوئی اتنا حسین بھی ہوسکتا ہے؟ پانچ برس کا پیارا سا بیٹا ماں کی انگلی تھامے کھڑا تھا۔ وہ تینوں ایک ساتھ اتنے مکمل لگ رہے تھے کہ میں پوری تقریب انہیں تکتے گئی۔ مجھے ان کی بیوی اچھی لگی تھی، وہ انہی کی طرح بے حد ملنسار اور شائستہ تھی البتہ میرا ان سے تعارف نہ ہوسکا کہ یہ وہ موقع تھا جب رضا کے اردگرد لگے جمگھٹے کے پیچھے میں چھپ جایا کرتی تھی۔

وہ تینوں ایک تصویر کھنچوانے کے لیے ساتھ ساتھ کھڑے ہوئے اور کیمرا پکڑے ذورین کے کہنے پر مسکرائے فلیش کی روشنی میں ان کی کاملیت اور بھی دمکنے لگی۔ کھٹا کھٹ بہت سے اسٹوڈنٹس ان کی تصاویر لینے لگے اور وہ ریڈ کارپٹ پہ فوٹو شوٹ کروانے والے اسٹار سلیبریٹز کے مانند ہر طرف کیمروں اور فلیش کی چکا چوند روشنیوں سے گھر گئے۔ اپنے موبائل سے بہت دور سے ایک تصویر میں نے بھی لی تھی۔

اس رات میں اس تصویر کو دیکھ کر بہت دیر تک روتی رہی تھی۔ کیا مجھے بتانے کی ضرورت ہے کہ کیوں؟

☆☆☆

کاریڈور میں اسٹوڈنٹس آجا رہے تھے۔ میں اپنی بیساکھی سے خود کو گھسیٹتی آہستہ آہستہ اس آفس کے دروازے کی جانب بڑھنے لگی جس پر رضا حیات خان کے نام کی تختی لگی تھی۔

دروازہ نیم وا تھا۔ میں نے دو دفعہ کھٹکھٹایا پھر جواب نہ پا کر ذرا سا دھکیلا تو وہ کھلتا چلا گیا۔

ان کی کرسی خالی تھی۔ البتہ ایک خالی کونے میں وہ جانماز بچھائے نماز پڑھ رہے تھے۔ جس پل میں نے دروازہ کھولا وہ اسی پل سجدے میں گئے۔ میرا دل احترام سے بھر گیا۔

ان کے سلام پھیرنے تک میں چوکھٹ میں کھڑی رہی۔ وہ فارغ ہوئے تو سر اٹھایا۔ چہرے پر حیرت آگئی۔

”میری اتنی برائٹ اسٹوڈنٹ اتنے تکلف سے ابھی تک دروازے پر کھڑی ہے، اس بات کا مجھے افسوس ہے۔ آئیں، بیٹھیں نا۔“ وہ تاسف و ندامت سے جانماز تہ کرتے اٹھ کھڑے ہوئے اور میرے لیے کرسی کھینچی۔

”سوری پروفیسر!“ میں لب کاٹتی دروازہ بند کر کے کرسی تک آئی۔ وہ اب گھوم کر میز کے پیچھے جا اپنی ریوالونگ چیئر پر بیٹھ رہے تھے۔ ان کا کوٹ کرسی کی پشت پر لٹکا تھا اور وہ شرٹ کی آستینیں کہنیوں تک موڑے، ٹائی کی ناٹ ڈھیلی کیے بہت بے تکلف اور ریلیکسڈ لگ رہے تھے۔

”لائیں کتاب دکھائیں، کون سا ٹاپک سمجھنا ہے آپ نے؟“ وہ میرے ہاتھ سے کتاب لے کر پلٹنے لگے۔ صبح کلاس کے بعد جب میں نے انہیں بتایا کہ مجھے ایک موضوع کے سمجھنے میں دشواری ہے تو انہوں نے فوراً مجھے ایک بجے اپنے آفس میں ملنے کو کہا تھا۔

”تو اس میں کیا سمجھ نہیں آیا آپ کو؟“ معلم





طول کر اب وہ اس پر سرسری نگاہ دوڑاتے ہوئے رہے تھے۔

”سر یہاں سے آگے......“ میں آگے ہو کر انگلی رکھ کر بتانے لگی۔ بہ مشکل دس منٹ لگے انہیں مجھے سمجھانے میں، اور ساری باتیں میری سمجھ میں آگئیں۔

”اب بتائیں چائے لیں گی یا کافی؟“ کتاب بند کر کے انہوں نے ایک طرف رکھ دی۔

”دونوں نہیں۔“

”پھر جوس تو لیں گی ہی۔“ وہ اٹھے اور سائڈ پر رکھی ٹی ٹرے سے ایک کین اٹھا کر کھولا اور ایک شیشے کے گلاس میں انڈیلا۔

”تھینک یو...... آپ کی وائف بہت اچھی ہیں پروفیسر۔“ میں نے اورنج جوس کا ایک گھونٹ بھر کر گلاس میز پر رکھا۔

”جانے بھی دو حلیمہ واؤد۔“ انہوں نے ایک اس مسکراہٹ کے ساتھ سر جھٹکا۔ میں شل رہ گئی۔

”کیوں پروفیسر...... کیا ہوا؟“

”اچھی مسلمان لڑکی وہ ہوتی ہے جو سر ڈھانپے، حجاب پہنے۔ اب آپ ہیں، مجھے آپ بالکل اپنی چھوٹی بہن کی طرح لگتی ہیں۔ اور سر ڈھکے تو آپ بہت اچھی لگتی ہیں۔ مگر میری بیوی......“ ایک تلخ مسکراہٹ ان کے چہرے پر بکھری تھی۔ ”میری بیوی میری نہیں ہے۔“ ان کا مجھے اپنی چھوٹی بہن کہنا مجھے معتبر کر گیا ان کی بیوی کا رویہ دکھی۔

”وہ ایسے کیوں کرتی ہیں؟“

”غرور...... اپنی ذات کا زعم، کچھ اپنے باپ کی دولت کا تکبر، ایک عام سے پروفیسر سے اتنے بڑے باپ کی بیٹی شادی کرے گی تو وہ برابری پہ تو کبھی نہیں آئے گی۔“

”ارینج میرج تھی؟“ میں اس وقت سب کچھ سوچنا چاہتی تھی سوائے اس کے کہ میں بہت پرسکل ہو رہی ہوں۔

”اونہوں...... لو میرج! یور کے لڈو۔“ ان کا وجیہہ چہرہ حزن و اداسی سے پُر تھا۔ میرا دل کٹنے لگا۔

”میں آپ کے لیے کچھ کر سکتی ہوں؟“

”پتا نہیں حلیمہ...... میں اپنے لیے خود کچھ نہیں کر سکتا تو تم کیا کرو گی۔ بعض دفعہ زندگی ایک مقام پر ٹھہر جاتی ہے، سمجھ نہیں آتا کہ کس طرف کو نکلیں۔ آگے یا پیچھے، ایسے میں اگر کوئی دل کا بوجھ ہلکا کر دے تو اچھا لگتا ہے۔ تم سے بات کر کے بھی اچھا لگا۔ اللہ تمہیں خوش رکھے۔“ پھر وہ میرے ساتھ ہلکی پھلکی دوسری باتیں کرنے لگے۔

وہ ساعتیں میری زندگی کی سب سے قیمتی متاع بن گئیں۔ ان کے آفس سے نکلتے وقت میرے اردگرد میرا ست رنگا بلبلہ تن چکا تھا۔ میں اسی میں مقید فضا میں تیرتی رہی تھی۔ میں جاگتی آنکھوں سے دن کی روشنی میں پہلی بار اپنا یاور بن گئی تھی۔

اس روز میں نے پہلی دفعہ ایک پھڑا بنایا تھا۔ البتہ یہ بات میں اس وقت نہیں جانتی تھی۔

☆☆☆

گھر پہنچی تو اماں رو رہی تھیں۔ ماموں آج بہت سی باتیں سنا کر گئے تھے۔ ان کی مطلوبہ رقم کا انتظام نہیں ہوسکا تھا۔ اور وہ اب مجھے اور اماں کو سامان سمیت مکان سے باہر پھینکنے کی دھمکی دے کر گئے تھے۔

”خون سفید ہو گیا ہے کرامت بھائی کا۔“ اماں کو ماں جائے کی بے حسی رلا رہی تھی۔ میرا دل بھی دکھ میں گھرتا گیا۔ عجیب مایوسی کا عالم تھا۔ پریشانی کے باعث رات میں اماں کی حالت بگڑتی گئی تھی۔ بخار نے ایسا آن گھیرا کہ غشی کے دورے پڑنے لگے۔

رات کے تیسرے پہر وہ بہ مشکل دوا سے کچھ

سنبھلیں تو میں باہر برآمدے میں آبیٹھی۔ میرا دم گھٹ رہا تھا۔ پریشانی در پریشانی ہر مسئلے کے آخر میں اگر مجھے کوئی ایک شخص نظر آتا جو میری مدد کرسکے تو وہ رضا حیات تھے۔ کیسے اور کیوں، میں نہیں جانتی تھی۔ صبح کے چار بجے بالآخر دل کے ہاتھوں ہار کر میں نے موبائل اٹھایا اور رضا کا نمبر ملایا جو انہوں نے مجھے آفس میں دیا تھا۔ دوسری گھنٹی پہ فون ریسیو کرلیا گیا۔

''حلیمہ داؤد نے اتنی جلدی مجھے کیسے یاد کرلیا؟'' وہ اتنا ہشاش بشاش تھے کہ میں لمحے بھر کو اپنا مسئلہ بھول گئی۔

''آپ جاگے ہوئے تھے؟''

''ہاں، ابھی تہجد پڑھ کر فارغ ہوا تھا۔ تم بتاؤ، کیسی ہو؟'' جواباً میں نے کچھ کہنے کے لیے لب کھولے تو دل بھر آیا۔ گلا رندھ گیا۔

''حلیمہ...... تم رو رہی ہو؟'' وہ فکر مند ہوگئے تھے۔ میں آنسوؤں اور سسکیوں میں سب کہتی چلی گئی...... آخر میں وہ دھیرے سے ہنسے۔

''اتنی سی بات......؟ اور میں سمجھا کہ پتا نہیں کیا ہوگیا ہے۔''

''یہ اتنی سی بات نہیں ہے۔''

''ہے...... بالکل ہے...... اور یہ مسئلہ صبح تک حل ہوجائے گا۔'' ''ویسے کدھر رہتے ہیں تمہارے ماموں؟'' بے خیالی میں، میں نے ماموں کا ایڈریس اور نمبر دے دیا۔ پتا نہیں وہ ان کو کیسے سمجھائیں گے۔

''بس صبح تک میں سب ٹھیک کرلوں گا۔ اچھا بتاؤ، تم نے رات سے کچھ کھایا یا نہیں؟''

''نہیں۔''

''پھر میں ہولڈ کرتا ہوں، جاؤ کچن میں اور کچھ پلیٹ میں لے کر آؤ پھر باتیں کرتے ہیں۔''

''اچھا۔'' میں نے فون رکھا اور مسکراتے ہوئے اٹھی۔ مجھے اپنے بھاری کندھے ہلکے ہوتے محسوس ہو رہے تھے۔

اس صبح ہم نے بہت سی باتیں کیں۔ بچپن اسکول کے زمانے کی، اپنی اپنی فیملیز کی، گھر دوستوں کی۔ مجھے وہ بھی اپنی طرح اکیلے اور اندر زمانے کے ڈسے ہوئے لگے تھے۔ میں بہت آہستہ ان بہت قریب آگئی۔

اور پھر اس صبح وہ یونیورسٹی نہیں آئے۔ شام ماموں نے اماں کو شکریے کا فون کیا کہ ان کو ہمارے بھیجے بندے نے پیسے ادا کردیے تھے۔ اماں حیران تھیں ان کو تو نہیں البتہ مجھے ضرور کہا۔

''کس نے ادا کیے پیسے؟''

''ایک دوست نے مدد کی ہے۔ میں اسے لوٹا دوں گی۔''

''مگر......''

''آپ آم کھائیں، پیڑ کیوں گنتی ہیں؟'' چپ ہوگئیں مگر اگلے روز جب میں نے رضا سے واپسی کی بات کی تو وہ ''ارے چھوڑو'' کہہ کر بات ٹال گئے۔ میں نے اصرار کیا تو وہ شرمندہ ہونے لگے۔

''اگر اب تم نے پیسوں کی کوئی بات کی تو سمجھوں گا کہ حلیمہ داؤد میری سب سے بری اسٹوڈنٹ نہیں ہے۔'' اور پھر میں نے پیسوں کی بات نہیں کی مگر...... مگر واقعی...... دیکھیں میں واقعی پیسوں کی کوئی بات نہیں کی تھی پھر بھی...... پھر کیوں...... کیوں چند روز بعد مجھے علم ہوا کہ میں اب سب سے برائٹ اسٹوڈنٹ نہیں ہوں؟ یا شاید رہی؟

کیوں نہیں رہی اور کب سے نہیں رہی؟

ہاں، تب سے جب قلزہ ابراہیم ہماری زندگیوں میں آگئی۔

قلزہ...... وہ ہیرا جو ڈھلتا نہیں، صرف ٹوٹتا





دفعہ ٹوٹے تو پھر کبھی جڑ نہیں سکتا۔

☆☆☆

''قلزہ ابراہیم، نائس نیم...... مگر کلاس کو یہ تو بتائیں کہ قلزہ کا مطلب کیا ہوتا ہے؟'' پوری کلاس میں سناٹا چھایا تھا اور بہت سی نگاہیں رشک و حسد سے رضا حیات کی مخاطب کو دیکھ رہی تھیں۔

وہ لیٹ ایڈمیشن تھی۔ دیر سے آنے والے مگر چھا جانے والوں میں سے تھی۔ کانچ سی لڑکی، بے حد گوری ملائم جلد اور لانبی آنکھوں کی مالک۔ اس کے بال کمر تک گرتے تھے۔ سیدھے، سلکی سیاہ بال اور وہ انہیں سمیٹ کر دائیں شانے پر آگے کو ڈال دیتی تھی۔ اس کا لباس بھی بہت جدید تراش خراش کا، تھوڑے بے باک سا تھا۔ آستین، غائب، کھلا گلا اور گردن سے لپٹا دوپٹا...... وہ بہت خوب صورت تھی، نازک سی کسی ادھ کھلے پھول کے مانند جسے چھونے سے بھی میلے ہونے کا خدشہ ہو۔

''قلزہ یعنی ڈائمنڈ!'' وہ اپنی نازک، لمبی گردن کو ذرا سے اٹھائے بولی تو رضا حیات دھیرے سے مسکرائے۔

''ڈائمنڈ...... جو ڈھلتا نہیں صرف ٹوٹتا ہے؟''

''اور اگر ایک دفعہ ٹوٹے تو پھر کبھی نہیں جڑتا۔'' بڑا اعتماد طریقے سے بولی۔

''آپ نے اتنا لیٹ ایڈمیشن کیوں لیا ہے؟'' جواباً قلزہ نے نزاکت سے شانے اچکائے۔ اس کے شانے اچکانے کا اپنا ایک منفرد انداز تھا۔

''موڈ نہیں بنا، بس۔''

''چلیں، اچھا ہے کہ اب موڈ بن گیا تو کلاس! ملیے قلزہ ابراہیم سے۔ ہماری مستقبل کی برائیٹسٹ اسٹوڈنٹ سے۔''

میں بُری طرح چونکی مگر رضا حیات میری طرف دیکھ رہے تھے۔ وہ قلزہ کی جانب متوجہ تھے۔ آج مجھے ان کی نگاہوں سے اوجھل کرنے کے لیے کسی ہجوم کی ضرورت نہیں تھی۔ قلزہ پورے ہجوم پر بھاری تھی۔

مگر میں فیصلہ نہ کرسکی کہ مجھے قلزہ اچھی لگی ہے یا بری لیکن یہ طے تھا کہ وہ میری جگہ لے چکی تھی۔

☆☆☆

کلاس کے دوران وہ لیکچر کم نوٹ کرتی اور تیکھے سوال زیادہ کرتی۔ لیکچر کا زیادہ تر وقت رضا اس کے ہر سوال کا پورے تحمل سے جواب دینے میں گزار دیتے۔ وہ انہیں زچ کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیتی۔ اس کے بعض سوالوں میں کوئی سینس نہ ہوتا تھا۔

''بندر کی دم کیوں ہوتی ہے سر حیات؟'' میں حیرانی سے سوچتی کہ اس بے تکے سوال کا کیا جواب ہوسکتا ہے۔

''کیونکہ بندر کو درخت سے لٹکنا ہوتا ہے۔ سو وہ اپنی دم کو شاخوں پر رول کر کے لٹکتا ہے۔'' رضا بہت



> ## استاد کی قدر و عظمت
>
> فاتح عالم سکندر ایک مرتبہ اپنے استاد ارسطو کے ساتھ گھنے جنگل سے گزر رہا تھا۔ راستے میں ایک بہت بڑا برساتی نالا آگیا۔ نالا بارش کی وجہ سے طغیانی پر آیا ہوا تھا۔ استاد اور شاگرد میں بحث ہونے لگی کہ خطرناک نالا پہلے کون پار کرے گا۔ سکندر بضد تھا کہ پہلے وہ جائے گا بالآخر ارسطو نے اس کی بات مان لی۔ پہلے سکندر نے نالا پار کیا پھر ارسطو نے نالا عبور کر کے سکندر سے پوچھا۔ ''کیا تم نے پہلے نالا پار کر کے میری بے عزتی نہیں کی؟'' سکندر نے ادب سے جواب دیا۔ ''نہیں استاد محترم، میں نے اپنا فرض ادا کیا ہے۔ ارسطو رہے گا تو ہزاروں سکندر تیار ہوسکتے ہیں لیکن سکندر ایک بھی ارسطو تیار نہیں کرسکتا۔''
>
> مرسلہ: رفعت جبین رفی، کراچی

صبر سے، مسکراتے ہوئے ہر بات کی وجہ بتاتے تو میں انہیں داد دیے بغیر نہ رہ سکتی مگر پھر......

"بندروں کا درختوں پر لٹکنا کیوں ضروری ہے، وہ ایسے ہی کیوں نہیں رہ سکتے؟"

"اُف......" میں دل ہی دل میں کڑھنے لگی تھی۔ فلزہ سے سب ہی اب کوفت کھانے لگے تھے۔ اس کے سوال وقت کا زیاں تھے اور کچھ نہیں، یہ بات سب پہ عیاں تھی پھر بھی رضا اسے جواب ضرور دیتے۔

اب ٹھیک سے یاد نہیں کہ اس روز میں رضا کے آفس کس کام سے گئی تھی شاید کوئی اسائنمنٹ جمع کرانا تھا۔ دروازہ نیم وا دیکھ کر میں نے دھکیلا تو سامنے کا منظر عیاں ہوا۔ فلزہ، رضا کے مقابل کرسی پر بہت بیزاری بیٹھی تھی۔ کہنی میز پر ٹکا کر ہتھیلی ٹھوڑی تلے جمائے، وہ بلند آواز سے کسی بات پر بحث کر رہی تھی۔ آہٹ پر اس نے گردن موڑ کر مجھے دیکھا اور پھر لب بھینچ لیے۔

"آیئے حلیمہ!" رضا نرمی سے مسکراتے ہوئے کھڑے ہوئے۔ میں چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی فلزہ کی کرسی تک آئی۔ اس کے ساتھ ایک خالی کرسی رکھی تھی۔ رضا نے اس خالی کرسی کی جانب اشارہ کیا۔

"بیٹھیں۔" فلزہ ایک دم کھڑی ہوئی، ایک تیکھی نگاہ مجھ پر ڈالی اور اکھڑے اکھڑے لہجے میں بولی۔

"آپ مصروف ہیں تو میں اپنا سوال پھر کلیئر کرلوں گی۔"

"ارے نہیں فلزہ، آپ بیٹھیں، میں نے حلیمہ سے چند ایک......"

"رہنے دیں، جارہی ہوں میں۔" ایک کڑی نگاہ مجھ پر ڈال کر اس نے میز پر رکھا پرس اٹھایا اور ٹھک ٹھک کرتے ہوئے کمرے سے نکلی پھر اپنے پیچھے زور سے دروازہ بند کیا۔

"ناسمجھ ہے، بچی ہے، تم برا مت مانتا بیٹھو۔"

"نہیں پروفیسر، بس یہ اسائنمنٹ......" میں نے کاغذوں کا پلندہ ان کی طرف بڑھایا۔

"او کے...... میں دیکھ لیتا ہوں۔ چائے پیو گی یا پھر کافی؟"

"کچھ نہیں، مجھے ذرا کام سے جانا ہے۔" م بنا کچھ سنے شکستہ قدموں سے پلٹ گئی۔ میں کیوں تھ اور کس کے لیے۔ مجھے اپنا آپ رضا پہ ایک بوجھ لگنے لگا تھا۔ ان کی زندگی کی مکمل تصویر میں میری کو جگہ نہیں تھی۔ آہستگی سے میں نے ان کے کمرے کا دروازہ بند کیا تو دیکھا فلزہ دیوار سے ٹیک لگائے سینے پر بازو لپیٹے کھڑی ہے، میں سر جھکائے آگے بڑھنے لگی تو وہ ایک دم میرے ساتھ چل دی۔

"کیا ہے تم میں حلیمہ داؤد کہ رضا حیات ہر وقت تمہاری باتیں ہی کرتے ہیں؟"

میں ٹھٹک کر اس کی جانب پلٹی، وہ عجیب تر ہوئی نگاہوں سے میرا چہرہ دیکھ رہی تھی۔

"حلیمہ یہ ہے، حلیمہ وہ ہے، انہیں حلیمہ سے آگے اور پیچھے کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ مجھے لگتا ہے جب تک تم ہو، وہ میری طرف کبھی نہیں دیکھ سکیں گے۔" اس کے لہجے میں اتنا کرب اور دکھ تھا کہ میں دنگ رہ گئی۔

"فلزہ! میرا اور تمہارا کیا مقابلہ؟"

"ہے نا! تبھی تو وہ میری ہر شے کو تم سے compare کرتے ہیں۔ میں کیا کروں کہ میں تم جیسی بن جاؤں حلیمہ؟" پھر اس نے میرے دونوں ہاتھ تھام لیے۔

"مجھے اپنے جیسا بنا دو حلیمہ داؤد شاید وہ مجھے ایک نظر دیکھ لیں۔" مجھے لگا اس کی لانبی پلکوں میں نمی ہے۔ اس وقت اس کے چہرے پر ایسا کرب تھا کہ میں یک ٹک اسے دیکھے گئی۔ زندگی میں پہلی دفعہ وہ مجھے بری نہیں لگی تھی۔

"اچھا! میرے ہاتھ چھوڑو لوگ دیکھ رہے ہیں۔ آؤ بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔" میں آگے چل دی اور وہ نخریلی نازک مزاج، شاہانہ سی لڑکی سر جھکائے میرے پیچھے ہولی۔

اس ہیرے کو توڑنے کی ضرورت نہیں تھی کہ وہ پہلے سے ٹوٹا ہوا تھا۔ اس کی روح، دل اور احساسات، سب ٹوٹ پھوٹ کا شکار تھے۔ وہ، وہ نہیں تھی جو کلاس میں لگتی تھی۔ وہ رضا کو زچ کرنے کے لیے سوال نہیں کرتی تھی۔ وہ وقت ضائع کرنے کے لیے بحثیں نہیں کرتی تھی۔ وہ تو صرف توجہ کی طالب تھی۔ اسے رضا کی توجہ چاہیے تھی۔ اسے صرف ان کی اپنے لیے کہی گئی چند باتیں چاہیے تھیں۔ وہ اپنا آئیڈیل اور اس کے روپ میں حلیمہ داؤد کا پرتو تھی مگر یہ بات میں اسے بتا نہ سکی۔

اس کے والدین آسٹریلیا میں تھے۔ وہ پڑھنے کے لیے پاکستان آئی تھی۔ پڑھنے کے لیے عموماً لوگ پاکستان سے آسٹریلیا جاتے ہیں مگر فلزہ کا ہر کام الٹا ہوتا تھا۔ وہ والدین سے دور رہنے کے لیے ادھر اپنی خالہ کے پاس رہنے آئی تھی۔ پڑھائی کا تو بس بہانہ تھا۔ اس کے پیرنٹس کی آپس میں کبھی نہیں بنی تھی اور نہ بننے کا امکان تھا۔ وہ ان کی روز، روز کی بک، بک سے نفسیاتی مریض بن گئی تھی اور پھر ادھر ارسل تھا۔ اس کا خالہ زاد، اس کے عشق میں پاگل...... مگر فلزہ کو اس سے نفرت کی حد تک کوفت تھی۔ وہ سارا وقت ارسل سے دور بھاگنے کی کوشش کرتی مگر اس کی آتش عشق بھڑکتی۔ شادی پہ اصرار سے لے کر موویز پہ ساتھ جانے تک۔ ارسل ہر بات پہ اس کی منت کرتا اور وہ انکار کرتی رہتی۔ اب تو اس کا گھر جانے کا دل ہی نہیں کرتا تھا۔ وہ توجہ کی طالب تھی اور من چاہی توجہ اسے صرف ایک ہی شخص دے سکتا تھا۔ رضا حیات خان......

"مجھے ہر طرف رضا کا چہرہ نظر آتا ہے۔ ہر دیوار، ہر کھڑکی، ہر درخت پہ۔ میں آسمان کو دیکھوں تو بھی وہ نظر آتا ہے۔ ایک دن میں ان کو کیمپس میں نہ دیکھوں تو میری سانس بند ہونے لگتی ہے...... میں کیا کروں حلیمہ؟" اور مجھے جو لگتا تھا کہ اس مرض عشق میں، میں اکیلی ہی مبتلا ہوں تو غلط لگتا تھا کہ وہ بھی میرے جیسی ہی تھی۔

اس روز ہم دونوں دوست بن گئے۔ ایک قطعاً بھدا سا جوڑ...... مگر خیر جوڑ تو بن گیا تھا۔ ہمارے درمیان ایک ہی اشتراک تھی اور کیا مجھے بتانے کی ضرورت ہے کہ کیا تھی؟

☆☆☆

رات کو فلزہ کی کال آگئی۔ وہ بری طرح رو رہی تھی۔

"ارسل نے کچھ کہا ہے کیا؟" میں پریشان ہوگئی۔

"بھاڑ میں گیا ارسل... میری زندگی میں ارسل سے زیادہ مسائل ہیں۔" وہ چلائی تو میں نے گہری سانس لی۔

"پھر......؟"

"پروفیسر رضا...... وہ میری کال نہیں اٹینڈ کر رہے۔"

"تو رو کیوں رہی ہو؟"

"اگر تمہاری کال اٹینڈ نہیں کریں تو تم روؤ گی نہیں؟"

"نہیں۔" حالانکہ مجھے پتا تھا کہ میں بھی رو دوں گی مگر گھٹ گھٹ کے اس کی طرح بہ آواز بلند نہیں۔

"تمہیں ان سے ویسی محبت نہیں ہے پھر جیسی

مجھے ہے۔"

"محبت کے پیمانے اپنی مرضی سے مت بھرو قلزہ۔ تم کسی کے دل کا حال کیا جانو۔"

"پر وہ تمہیں مجھ سے زیادہ محبت دیتے ہیں، زیادہ عزت دیتے ہیں، تمہیں چھوٹی بہن بولتے ہیں اور میں تو کہیں نہیں ہوں۔"

"بہن بولیں، بیٹی بولیں یا اسٹوڈنٹ...... ہم دونوں کا رشتہ برابر ہے۔" میں اسے سمجھانے لگی مگر وہ ضدی لڑکی کہاں سمجھتی تھی۔

"پتا ہے حلیمہ...... میری امی میرے ابو سے جب بہت لڑتی تھیں تو انہیں کہتیں کہ سب مرد ایک جیسے ہوتے ہیں اور تب میں سوچتی شاید واقعی ایسا ہے مگر اب رضا سے مل کر مجھے لگتا ہے کہ سب مرد ایک سے نہیں ہوتے۔ کچھ مرد رضا جیسے بھی ہوتے ہیں۔ عورت کو احترام اور عزت دینے والے، نگاہیں جھکا کر رکھنے والے، مضبوط کردار کے سچے مرد۔"

"بالکل!" میرے لبوں پر ایک معصوم مسکراہٹ بکھر گئی۔ رضا ایسے ہی تھے۔ نگاہیں جھکا کر بات کرنے والے۔ عموماً جب وہ میرے ساتھ مخاطب ہوتے تو وہ مجھے دیکھ بھی نہیں رہے ہوتے تھے۔

"لیکن پتا نہیں کیوں حلیمہ...... میں ان کی بیوی سے بہت جیلس ہوتی ہوں۔ پتا نہیں کیوں۔" فون رکھنے سے قبل اس نے کہا تو میں بے اختیار چونکی تھی۔

☆☆☆

بہت دن بعد رضا کا فون آیا تو میں بہت خوش ہوئی۔

"ہمیں کیسے یاد کرلیا، پروفیسر؟"

"کر تو لیا!" وہ دھیرے سے ہنسے۔

"گھر میں سب کیسے ہیں؟"

"اچھے ہیں، تم سناؤ، اسپیچ کمپیٹیشن میں حصہ لے رہی ہو؟"

"میں کہاں اچھا بول سکتی ہوں، پروفیسر؟"

"کوشش تو کر سکتی ہو۔"

"جانے دیں بلکہ قلزہ کا نام دے دیں نا۔ اچھا بول لیتی ہے۔"

"یہ تم دونوں کی دوستی کیسے ہوئی؟" وہ حیران ہوئے۔

"بس ہوگئی...... آپ کو برا لگا؟"

"نہیں...... قلزہ پیمپرڈ چائلڈ ہے۔ اسے [illegible] دیا کرو مگر......" وہ جیسے لمحے بھر کو جھجکے۔ "تھوڑا احتیاط کرنا، قلزہ میں بہت ٹینڈینسی ہے۔" انہوں فقرہ ادھورا چھوڑا تو میں چونکی۔

"کس چیز کی ٹینڈینسی؟"

"بس یونہی......"

"بتائیں نا......؟"

"بس یہی جھوٹ بولنے کی...... باتیں گھڑنے کی۔"

"رئیلی!" میں شاکڈ رہ گئی۔ "آپ کو کیسے پتا؟"

"مجھے پتا ہے، اس نے مجھے اپنے کزن بارے میں بتایا تو۔"

"ارسل؟"

"ہاں، ارسل۔" وہ دھیرے سے ہنسے۔

"کیوں؟ ارسل کیا اس کو اس طرح پسند کرتا جیسے وہ دعویٰ کرتی ہے؟"

"حلیمہ داؤد، تم بہت سیدھی ہو۔" انہوں گہری سانس لی۔ "تم نے اس کی ارسل والی با یقین کرلیا؟"

"کیوں نہ کرتی؟"

"حلیمہ...... ارسل کوئی نہیں ہے، قلزہ کا خالہ زاد کزن نہیں ہے۔ اس کی خالہ تو میرڈ ہی نہیں ہے۔"





"کیا......؟" میں ششدر رہ گئی۔

"اس کے اندر باتیں گھڑنے کی بہت گنجائش ہے۔ ذرا احتیاط کرنا۔ وہ بس توجہ لینے کے لیے ایسا کرتی ہے۔"

"اچھا۔" میں نے فون بند کیا اور سوچ میں ڈوب گئی۔ چند لمحوں بعد ہی فون دوبارہ بجا۔ میں چونک پڑی۔ قلزہ کالنگ......

"ہاں قلزہ؟" میں نے فون کان سے لگایا۔

"تمہارا نمبر بزی تھا، میں نے رضا کو ٹرائی کیا۔ ان کا نمبر بھی بزی تھا۔ تم لوگ آپس میں بات کر رہے تھے کیا؟"

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے قلزہ؟" باوجود اس کی شدت پسندی کے مجھے اس کی فکر رہتی تھی۔ اگر اس نے ارسل کو گھڑا تھا تو اپنا یاور کو میں نے گھڑا تھا۔ اگر وہ جھوٹی تھی تو میں بھی اتنی ہی جھوٹی تھی۔

"فرق یہ پڑتا ہے کہ مجھے کال کرنے کے لیے ان کے پاس وقت نہیں ہے مگر تمہارے لیے وقت نکل آتا ہے۔" وہ حسد کا شکار نہیں تھی، اسے صرف احساسِ [illegible] تھا۔

"انہوں نے صرف تقریری مقابلے کا پوچھنے کے لیے فون......"

"دیکھا...... دیکھا......" وہ اندازے کی درستی [illegible] پالی اور کھٹاک سے فون رکھ دیا۔

چند ساعتیں گزریں تو پھر اس کی کال آئی۔

"حلیمہ......" وہ رو رہی تھی۔ "میں پاگل ہونے لگی ہوں۔"

"خود کو سنبھالو قلزہ...... وہ تمہارے ٹیچر ہیں، تمہارے لیے کتنا کر سکتے ہیں؟"

"بس ایک نظر...... ہر دن میں ایک نظر کی تڑپ ہے۔" وہ اپنے آپ میں نہیں تھی، اس کی تڑپ زیادہ تھی۔

### سالگرہ کی بہار

بہار آئی گلاب مہکے
ہماری آنکھوں کے خواب مہکے
مہکتی کلیوں کو دیکھ کر پھر
محبتوں کی وہ سوئی خواہش
چہک کے بیدار ہوگئی ہے
گلوں کے شانے پہ سر لگا کر
صبا بھی سرشار ہوگئی ہے
وہ بھولے بسرے تمام لمحے
وہ ساعتیں وہ تمام جذبے
جو وقت کی دھول میں اٹ گئے تھے
خود اپنے اندر سمٹ گئے تھے
وہ لے کے انگڑائیاں جی اٹھے ہیں
ہماری آنکھوں میں جھانکتے ہیں
اے کاش! دل کی ویراں زمیں پہ
محبتوں کی پھوار برسے
برستی برکھا کہاں مقدر
دو بوند ہی تیرا پیار برسے
تو دیکھنا پھر کہ جان جاناں
ہماری آنکھوں کے ٹمٹماتے
چراغ یوں لو دے اٹھیں گے
کہ چاند تارے مدھم لگیں گے
دلوں کے غنچے یوں کھل اٹھیں گے
کہ پھول بھی مسکرا کے اپنی
قباؤں کو پھر سمیٹ لیں گے

شاعرہ: فاطمہ نجیب، کراچی

"تم ان کے بارے میں دوسرے طریقے سے مت سوچو۔"

"نہیں سوچتی...... اور وہ ایسے بندے ہیں بھی نہیں۔ وہ تو نظر بھر کر بھی مجھے نہیں دیکھتے۔ کوئی مرد اتنا

پارسا بھی ہوسکتا ہے؟''

''وہ تو ہیں نا۔''

''ہاں!'' وہ پھیکی سی ہنسی ہنس دی۔

''پتا ہے حلیمہ، اس روز میں ان کے آفس گئی تو وہ نماز پڑھ رہے تھے۔ میں زمین پر بیٹھ گئی اور ان کو نماز پڑھتے دیکھتی رہی۔ وہ سجدے میں جھک گئے تو میں سانس روکے ان کے اٹھنے کا انتظار کیے گئی۔ ان کی نماز اتنی آہستہ، دھیمی اور خوب صورت تھی کہ میں بتا نہیں سکتی۔''

''سو تو ہے۔'' اور پھر ہم دونوں گھنٹوں رضا کی باتیں کیا کرتے۔ ہمارے پاس گفتگو کے لائق کوئی اور موضوع رہا ہی نہیں تھا۔ ہمارے واحد بونڈ نے ہمیں ایک دوسرے سے جوڑ رکھا تھا اور پھر میں اور فلزہ الگ ہو ہی نہ سکے۔

☆☆☆

مجھے شدید ٹائیفائڈ نے آن گھیرا اور میں کئی دن تک بستر پر رہی۔ دوائیوں کا ایک ڈھیر تپائی پر دھرا رہتا اور میں نیم بے ہوشی کی حالت سے کبھی نکل پاتی اور کبھی نہیں۔

شاید مجھے یونیورسٹی سے ناغہ کیے چھٹا روز تھا جب فلزہ مجھے دیکھنے آئی۔

''دیکھو تو میرے ساتھ کون ہے؟'' اس کی آواز میں خوشی کی رمق تھی۔ میں نے بہ دقت آنکھیں کھولیں تو دیکھا رضا حیات چوکھٹ میں کھڑے تھے۔

''پروفیسر!'' میرے لب پھڑپھڑائے، آنکھوں میں آنسو اتر آئے۔

''اب رضا آئے ہیں نا تمہیں دیکھنے، اب تم بالکل ٹھیک ہو جاؤ گی۔'' وہ بے تکلفی سے کہتی میرے سرہانے آبیٹھی پھر رضا کے لیے ساتھ ہی کرسی کھینچی۔

''آئیں رضا، بیٹھیں نا۔'' وہ اسی طرح ان کو نام سے پکارتی تھی۔

''کیسی ہیں آپ حلیمہ داؤد؟ ہم سب کو پریشان ہی کر دیا۔'' وہ میرے قریب کرسی پر بیٹھے۔ دھیمے لہجے میں کہہ رہے تھے۔

''بس!'' میرا گلا رندھ گیا۔ میں لیٹی ہی رہی اٹھنے کی سعی بھی نہیں کی۔

''اللہ آپ کو صحت دے گا۔ یہ بیماری کچھ نہیں سوائے اس کے کہ یہ پاک کرنے والی ہے۔''

''تھینک یو پروفیسر۔'' میری آواز بھیگی ہوئی تھی۔

''رضا..... آپ تو اتنے نیک ہیں، اب عبادت گزار ہیں، کچھ پڑھ کر پھونکیں نا حلیمہ پر کہ ٹھیک ہو جائے۔''

''اتنا بھی نیک نہیں۔'' وہ جھینپ گئے۔

''ہیں نا..... حلیمہ تمہیں پتا ہے رضا چھ سال عمر سے تہجد پڑھ رہے ہیں اور آج تک ان کی کوئی تہجد نہیں چھوٹی۔''

''جانے دو فلزہ۔'' وہ شرمندہ ہوگئے اور میں سوچنے لگی کہ جس شخص کی ستائیس سال تک کوئی تہجد رہی ہو، اس کا مقام اللہ کے نزدیک کیا ہوگا؟ میرا رعب سے بھرنے لگا۔

پھر وہ اٹھے اور میرے سر پر ہاتھ رکھ کر ہو سے کوئی آیت پڑھنے لگے۔ ان کا عربی لہجہ بہت خو صورت تھا۔ چند لمحے بعد وہ خاموش ہوئے اور ہاتھ ہٹا دیا۔

''اب تم ٹھیک ہو جاؤ گی۔'' جاتے ہوئے نے بس اتنا ہی کہا تھا۔

رات تک وہ ٹائی فائڈ جو پہلے اترنے کا نام لے رہا تھا، یوں غائب ہوا جیسے کبھی چڑھا ہی نہ ہو اگلی صبح میں ہشاش بشاش سی کیمپس میں تھی..... حیران نہیں تھی۔

جس شخص نے ستائیس سال اللہ کی عباد ہو۔ اللہ اس کی بات کیوں ٹالتا حلیمہ؟'' اور میں اس سے متفق تھی۔

☆☆☆

ان دنوں فلزہ بہت خوش رہنے لگی تھی۔ اس کے چہرے پر ایک چمک اور الوہی مسکراہٹ ہمہ وقت رہتی۔ اب وہ رضا کو زچ کرنے والے سوال بھی نہیں کرتی تھی بلکہ ہر دم میرے ساتھ رضا کی باتیں کرتی۔ ان کو کھانے میں یہ پسند ہے، ان کو پرفیوم کی یہ برانڈ اچھی لگتی ہے، ان کا پسندیدہ لباس یہ ہے، وہ قرآن کے حافظ ہے اور ہر وہ بات جو میں نہیں جانتی تھی فلزہ کو معلوم ہوتی تھی۔ رضا کے بارے میں وہ مجھ سے کچھ غلط نہیں کہتی تھی۔ گو کہ ارسل کے قصے اب بھی اس کی زبان پہ ہوتے لیکن اب وہ بہت کم ہی وہ قصے سناتی۔ رضا اس کی ہر بات کا آغاز و اختتام ہوتے تھے۔

شاید رضا اس کی ذہنی حالت اور دیوانگی بھری طبیعت کو سمجھ چکے تھے۔ تبھی اس کو زیادہ وقت دینے لگے۔ وہ اکثر کلاس آف ہونے کے بعد بھی گھنٹوں رضا کے آفس میں بیٹھے باتیں کرتے رہتے۔ فلزہ گھر لیٹ جانے لگی تھی اور جب گھر جاتی تو بھی رضا کو فون پر مصروف رکھتی۔ پڑھائی پر سے اس کی توجہ ہٹ چکی تھی۔ وہ نہ امتحان قریب ہونے پر دھیان دیتی، نہ اسائنمنٹس پر وہ تو اب لیکچر نوٹ کرنے کا تکلف بھی نہ کرتی تھی۔ رضا کی کلاس میں قلم ہونٹوں میں دبائے ہتھیلی پر ٹھوڑی ٹکائے یک ٹک رضا کو دیکھے جاتی۔ دوسری کلاسز بنک کر دیتی۔

پہلے میں ہفتے میں ایک بار رضا کے آفس چلی جایا کرتی تھی کوئی موضوع سمجھنا ہوتا یا ایسے ہی دل بھاری ہو جاتا تو ان سے بات کرکے اچھا لگتا تھا۔ مگر اب سے وہ فلزہ کو زیادہ وقت دینے لگے، میرے لیے وقت کا خانہ تنگ ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ کلاس میں لیکچر





کے علاوہ مہینہ گزر جاتا اور میں شاید ہی ان کی شکل دیکھ پاتی۔

میں نے بھی پھر انہیں آزاد چھوڑ دیا۔ استاد اور شاگرد کا رشتہ اس سے آگے کہاں جا سکتا تھا بھلا؟ مجھے یہ بات سمجھ آگئی تھی۔ مگر پھر بھی اپنے ہر مسئلے کے حل کے لیے میں ان کی طرف دیکھتی۔ میرے دل میں ایک امید جاگ اٹھی تھی کہ اگر رضا میرے لیے دعا کریں تو میری مفلوج ٹانگ ٹھیک ہو سکتی ہے۔ چھوٹے شرارتی بچوں کی طرح بھاگنے اور دوڑنے کو میرا دل چاہنے لگا تھا۔

مگر ایک اذیت بھی تھی۔ عشق لاحاصل......

کدھر لے جائے گا یہ عشق لاحاصل مجھے؟ میری روح تھکنے لگی تھی۔ میں رضا کی محبت میں فلزہ کی طرح ڈوب چکی تھی مگر اس کا انجام کار کیا تھا؟ اس دوڑ کی آخری لکیر کدھر تھی؟ لیکن اپنے بارے میں اب میں کہاں سوچتی تھی۔ میں تو فلزہ اور رضا کی قلم کی خاموش تماشائی بن چکی تھی۔

☆☆☆

چند ہفتے مزید گزرے تو مجھے فلزہ میں ذرا فرق محسوس ہوا۔ وہ اب پہلے سے زیادہ کھوئی کھوئی رہنے لگی تھی۔ میں اس سے مخاطب ہوتی تو وہ پکارے جانے پر بری طرح چونک جاتی۔ کبھی ڈر جاتی۔ بات بے بات رونے لگ جاتی۔ آنسو اس کی پلکوں سے ٹوٹ کر بہنے کو تیار ہوتے۔

''فلزہ تمہیں کیا ہوا ہے؟''

''ہوں، کچھ نہیں، کچھ نہیں.....'' وہ پھیکا سا مسکرا کر کہتی تو میں مطمئن نہ ہوتی۔

''کوئی مسئلہ ہے فلزہ؟''

''نہیں نا...'' اس کی رنگت اب زرد رہنے لگی تھی۔ میں بہت پوچھتی مگر وہ چھپا جاتی۔

پھر ایک روز وہ ہوا جو مجھے ساری زندگی اذیت

دیتا رہے گا۔ میں جو فلزہ کے لاکھ چھپانے پر بھی کرید میں لگی رہی۔ ایک روز سب کچھ ایک دم سے جان گئی اور وہ میری زندگی کا بدترین دن تھا۔

☆☆☆

"پروفیسر رضا کہتے ہیں کہ میں ان کی چھوٹی بہنوں کی طرح ہوں حلیمہ...... کتنا معتبر کر دیتا ہے یہ رشتہ آپ کو۔ اب میں انھیں رضا بھائی بلانے لگی ہوں۔ وہ خالی رضا بلانے پر ٹوکتے ہیں۔" ہم دونوں لائبریری کے باہر سیڑھیوں پر بیٹھے تھے۔ جب وہ از خود بتانے لگی۔ ہمارے درمیان اس موضوع کے علاوہ کسی دوسرے پر بھی بات ہی نہیں ہوتی تھی۔

"یہ تو اچھی بات ہے۔"

"مگر میں ان کی بیوی سے بہت جیلس ہوتی ہوں حلیمہ۔"

"ایسا مت سوچو رضا کے بارے میں، تمام مرد ایک سے نہیں ہوتے۔"

"وہ تو مجھے پتا ہے اور رضا بھائی جیسا تو کوئی نہیں ہے۔ جس شخص نے ستائیس برس تک اللہ کی عبادت کی ہو اس کو تو سب معاف ہے نا؟"

"ہاں! نہیں، پتا نہیں۔" میں نے نا سمجھی میں سر ہلایا۔ مجھے اس کی بات سمجھ نہیں آئی تھی۔

"اچھا چلو، کینٹین چلتے ہیں۔" وہ فائل اٹھا کر کھڑی ہوئی تو ایک چھوٹا سا تہ شدہ کاغذ اس کی فائل سے گرا اور میرے قدموں میں آن ٹھہرا۔

وہ اپنی دھن میں آگے بڑھ گئی۔ ویسے بھی وہ ذرا غائب دماغ رہنے لگی تھی۔ آگے پیچھے کا ہوش اسے نہیں رہتا تھا۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر کاغذ اٹھایا اور اسے پکارا۔

"فلزہ" مگر وہ دور نکل چکی تھی۔

میں نے کاغذ کی تہیں کھولیں شاید اس کا کوئی اسائنمنٹ ہو میں جمع کرا دوں گی یہی سوچ کر میں نے وہ کاغذ کھولا تھا۔

وہ ایک پرعذر کاغذ تھا۔ میں اسے پڑھتی گئی، بار بار پڑھتی گئی یہاں کہ میرے وجود سے جان نکل گئی۔ میری آنکھوں کے آگے اندھیرا چھانے لگا لیکن پھر میں نے ہمت مجتمع کی اور کاغذ اپنے بیگ میں رکھ کر اٹھی۔

"فلزہ۔" میں نے اسے جالیا۔ "کینٹین نہیں، لائبریری چلو۔"

"کیوں؟" وہ کسی خیال سے چونکی۔

"چلو نا......" میں اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے کھینچتے ہوئے زبردستی لائبریری کی طرف لے آئی۔

اندر سناٹا چھایا تھا۔ ہم دونوں کتابوں کے ایک ریک کے پاس جا کھڑے ہوئے اور مجھے پتا تھا کہ مجھے کیا کرنا ہے۔ میں نے کونے میں رکھی ایک کتاب اٹھائی اور فلزہ کی طرف مڑی۔

"ایک بات پوچھوں؟ سچ سچ بتانا۔" میں نے بائیں ہاتھ میں اس کا سوکھا ہاتھ سختی سے جکڑ لیا تھا کہ وہ بھاگنے نہ پائے۔

"ہاں بولو۔" وہ حیران سی کھڑی تھی۔

"یہ بچہ کس کا ہے؟"

"کیا؟" اس نے الجھ کر مجھے دیکھا۔

"تم کس کے بچے کو جنم دینے والی ہو؟ تمہاری پریگنینسی رپورٹس پازیٹو آئی ہیں۔"

"نہیں!" اس کا رنگ لٹھے کے مانند سفید پڑ گیا۔ بے اختیار اس نے اپنا ہاتھ میرے ہاتھ سے نکالنا چاہا مگر میں نے گرفت اور مضبوط کر دی۔

"بولو...... یہ بچہ کس کا ہے؟" میں سرخ آنکھوں سے اس کی آنکھوں میں دیکھ رہی تھی۔

"نن...... نہیں......" اس کا رنگ نچڑ چکا تھا۔ وہ بے جان لاش بنی پتھرائی ہوئی مجھے دیکھ رہی تھی۔





"نام بتاؤ مجھے اس کا۔ کون ہے وہ؟"

وہ بار بار لب کھولتی...... پھر بند کر لیتی۔

"فلزہ...... جواب دو۔" میں نے اسے جھنجوڑ ڈالا۔

"ار...... ارسل کا!" بہ مشکل وہ بول پائی۔

"جھوٹ! تمہارا ارسل نام کا کوئی کزن نہیں ہے۔"

"نہیں۔" اس کی آنکھوں میں خوف اتر آیا۔ وہ اپنا ہاتھ چھڑانے کی سعی کرنے لگی۔

"یہ قرآن ہے، اس پر ہاتھ رکھ کر بتاؤ یہ بچہ کس کا ہے، کس کے ساتھ کیا ہے تم نے گناہ۔" میں نے اس کا ہاتھ زبردستی اپنے ہاتھ میں پکڑی ہوئی کتاب پر رکھا تو وہ ایک دم وحشت زدہ سی ہو کر تڑپنے لگی۔ وہ محض ایک عام سی کتاب تھی مگر فلزہ اسے قرآن سمجھ کر لرز اٹھی تھی۔

"نہیں...... نہیں......" وہ خود کو چھڑانا چاہتی تھی مگر چھڑا نہیں پا رہی تھی۔

"نام بتاؤ فلزہ...... بس نام۔" وہ رونے لگ گئی۔ میری منتیں کرنے لگی کہ میں اسے چھوڑ دوں مگر جب میری گرفت سے خود کو نہ چھڑا سکی تو ایک دم اس کے لبوں سے گھٹی گھٹی سی چیخ نکلی۔

"میں نے جان بوجھ کر نہیں...... اس نے مجھے مجبور کیا...... زبردستی......"

"کون ہے وہ؟" اور اس کے کچھ کہنے سے پہلے ہی میں اس کا جواب جانتی تھی۔

"رضا...... رضا حیات...... خان۔" میں نے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ وہ بے دم سی پیچھے دیوار سے جا لگی اور وحشت سے پھٹی آنکھوں سے مجھے دیکھنے لگی۔ وہ شاید خود بے یقین تھی۔

میری بیساکھی زمین پر گر گئی۔ میں خود بھی آہستہ سے فرش پر آ بیٹھی اور پھر دونوں ہاتھ ماتھے پر رکھے رونے لگی۔ میرا سب کچھ ختم ہو گیا تھا۔ میرا سب کچھ لٹ گیا تھا۔ میرا پارس پتھر جل کر کوئلہ بن چکا تھا۔

لوگ میرے ارد گرد اکٹھے ہونے لگے اور میں روتی گئی، کوئی وجہ پوچھتا اور کوئی تسلی دیتا۔ سب حیران پریشان تھے کہ یہ بدصورت لنگڑی لڑکی یوں زمین پر بیٹھی کیوں رو رہی ہے۔

"شاید اس کا کوئی مر گیا ہے۔" کسی نے ہمدردی سے تبصرہ کیا۔ بات ٹھیک تھی میرا عزازیل مر گیا تھا۔ میں یونہی بلک بلک کر بچوں کی طرح روتی رہی۔ یہاں تک کہ لوگوں کا ہجوم چھٹتا گیا اور میں لائبریری میں تنہا رہ گئی۔ تب میں اٹھی اور وہ کتاب اٹھائی اور اپنی...... بیساکھی کے سہارے خود کو گھسیٹتی باہر جانے لگی۔

گھر تک کا سفر اس روز بہت طویل، بہت کٹھن لگ رہا تھا۔ میں آنسوؤں سے بھری آنکھوں سے سامنے دیکھتی، بے خودی چلتی جا رہی تھی۔ وہ ساحر تھا...... اس کے ایک اشارے پر بل کھاتی رسیاں سانپوں کی طرح دکھتی تھیں۔ مگر سحر اور معجزے میں یہی تو فرق ہوتا ہے، سحر سے رسیاں سانپوں کے مانند دوڑتی ہوئی لگتی ہیں مگر سانپ بن نہیں جاتیں۔ جلد یا بدیر جادو کا اثر زائل ہو جاتا ہے اور معجزہ عصا کو واقعی اژدہا بنا دیا کرتا ہے۔ ایسا فرقان عطا کرتا ہے کہ ہر شے یوں الگ الگ ہو جاتی ہے جیسے سمندر میں اکٹھا بہتا کڑوا اور میٹھا پانی جو کبھی ایک دوسرے میں داخل نہیں ہو پاتا۔

میں اندھیرے میں ڈوبتے فٹ پاتھ پر چلتی جا رہی تھی۔ میری بیساکھی کی ٹک ٹک مغرب کی اذانوں میں گم ہو رہی تھی۔

کتنا عرصہ ہوا میں نے ہر مسئلے کے حل کے لیے رضا کا چہرہ دیکھنا شروع کر دیا تھا۔ میں سمجھی تھی مجھے ان سے عشق ہے مگر نہیں...... میں نے تو انہیں اپنا خدا......

مجازی خدا بنالیا تھا۔ صدیوں پہلے جب نیل کا دریا پار کر کے اسرائیل کی اولاد ایک بستی پر سے گزری تھی تو ان ناخلف لوگوں نے بستی والوں کے جھوٹے معبودوں کی عبادت دیکھ کر موسیٰ سے کہا تھا کہ ہمیں بھی ایک ایسا الہ (معبود) بنادو۔ میں نے بھی یہی کیا تھا جب رضا حیات کو دیکھا تو دل نے خواہش کی کہ میں بھی اس پر نچھاور ہو سکوں۔... پھر جب موسیٰ کوہِ طور سے نہ لوٹے اور بنی اسرائیل پہ مدت لمبی ہوگئی تو انہوں نے کہا کہ موسیٰ کا الہ اس سے گم ہو چکا ہے۔ مجھ پر بھی مدت لمبی ہوگئی تھی۔ میں نے بھی لاشعوری طور پر یہ سمجھا تھا کہ میری مدد کرنے والا میرا الہ مجھ سے کھو گیا ہے اور پھر میں نے بچھڑا بنالیا، جیسے بنی اسرائیل نے بنایا۔ ایک سونے کا چمکتا، دمکتا، بے حد خوب صورت بچھڑا۔

مجھے اس کے سوا کچھ دکھائی نہیں دیتا تھا، میں نہیں جانتی مگر میرا، حساب شروع ہو چکا تھا، کوئی میرے اندر بار بار مجھ سے پوچھتا رہا تھا کہ کہاں ہے تمہارا وہ مددگار مجازی خدا؟ پکارو رضا حیات کو۔ وہ آئے اور تمہیں اس اذیت سے نکالے جس میں فلزہ کے اعتراف نے تمہیں دھکیل دیا ہے۔

میں اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتی مگر وہ چہرے جو ہر مصیبت کی گھڑی میں میرا مشکل کشا بن کر سامنے آتا تھا۔ آج مجھ سے گم ہو چکا تھا۔

میرا عزازیل، ابلیس بن گیا تھا۔

☆☆☆

"میرا قصور نہیں تھا...... انہوں نے مجھے مجبور کیا۔ انہوں نے کہا کہ ہمارا یہ تعلق مذہب اور معاشرے کی پابندیوں سے ماورا ہے۔" وہ درخت سے ٹیک لگائے آنسوؤں سے بھیگے چہرے کے ساتھ کہہ رہی تھی۔ انہوں نے مجھے مطمئن کیا اور میں مطمئن ہوگئی۔ تم جانتی ہو وہ لفظوں کے ساحر ہیں۔ ان کو انکار کرنے کی ہمت مجھ میں نہیں تھی۔"

میں ویران نگاہوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ فلزہ کا چہرہ بیماری کی حد تک زرد پڑ چکا تھا۔ آنکھوں تلے حلقے اور گالوں میں گڑھے پڑ گئے تھے۔ وہ اتنی کمزور اور اجڑی ہوئی تھی۔ اسے دیکھ کر پہلی نظر میں بتایا جاسکتا تھا کہ وہ زندہ لاش بن چکی ہے۔

"حلیمہ میں انہیں کہتی ہوں کہ وہ مجھ سے شادی کرلیں مگر وہ نہیں کرتے۔ وہ ہر دفعہ شادی کی بات ٹال دیتے ہیں۔ وہ بات ادھر ادھر گھما دیتے ہیں۔ کیا وہ مجھ سے شادی کرلیں گے؟"

"شاید نہیں...... ایک پرفیکٹ فیملی کے ہوتے ہوئے وہ کیوں یہ رسک لیں گے جبکہ انہیں بغیر شادی کے بھی سب مل رہا ہے۔"

"حلیمہ!" اس نے تڑپ کر مجھے دیکھا۔ "جب سے میری رپورٹس آئی ہیں میں ان سے نہیں ملی۔ بس فون پر ہی زور دیتی ہوں شادی پر۔"

"اور اب تم ان سے ملوگی بھی نہیں...... سنا تم نے؟" میرے سختی سے کہنے پر اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

چند روز گزرے اور اس نے اپنی خالہ کا گھر چھوڑ دیا۔ وہ میرے گھر آکر رہنے لگی۔ اماں کو اعتراض ہوا مگر میں نے انہیں منالیا کہ شوہر نے طلاق دے دی ہے، وہ بے چاری کدھر جائے؟ اور جب اماں کو میری زبانی علم ہوا کہ ماموں کو کرائے کی رقم دینے والی فلزہ ہی تھی تو ان کے سارے اعتراض اور شکوک و شبہات دور ہوگئے۔

میرا ہیرا ٹوٹ چکا تھا اور میں پُرامید نہیں تھی کہ وہ دوبارہ کبھی جڑ بھی پائے گا یا نہیں۔

زرد چہرہ اور نڈھال وجود لیے وہ یا تو بستر پر پڑی خلاؤں میں گھورتی رہتی یا پھر بے آواز آنسوؤں سے روتی رہتی۔ زندگی فلزہ کے لیے ختم ہو چکی تھی

رضا اب اس کی کال بھی اٹینڈ نہیں کرتے تھے۔ وہ ان کی آواز سننے کو ترپ گئی تھی۔ مر رہی تھی مگر وہ بہت مصروف تھے۔ آج کل وہ ایک مائیگریشن کروا کے آنے والی لڑکی ردا قاسم کے ساتھ دیکھے جاتے تھے۔ مگر اتنے نیک، شریف اور پارسا پروفیسر کے ساتھ ظاہر ہے ردا قاسم صرف اس لیے دیکھی جاتی تھی کیونکہ وہ اسے آنے والے ڈی بیٹ کمپٹیشن کی تیاری کروا رہے تھے اور اسی لیے اکثر جب ردا ان کے آفس میں ہوتی تو دروازہ اندر سے لاکڈ ملتا تھا۔

"میں جانتی ہوں وہ لڑکیوں کو اپنے آفس میں گھیر کر کیا کرتے ہیں۔" فلزہ درد سے رو پڑتی تھی۔

"میں سب جانتی ہوں مگر میری بات پر کوئی یقین نہیں کرے گا۔" وہ یونہی بلکتی رہتی اور میں خالی خالی نظروں سے اسے دیکھے جاتی۔ دنیا صرف اس کی نہیں لٹی تھی۔

☆☆☆

"سر ہم نے سنا ہے کہ آپ قرآن بہت اچھا پڑھتے ہیں۔ پلیز ہمیں بھی سنائیے۔" ردا قاسم ہمیشہ کی طرح چہک رہی تھی اور رضا جو کتاب کھول کر لیکچر شروع کرنے ہی والے تھے ذرا سا جھینپ گئے۔

"اب ایسی بھی بات نہیں ہے۔"

"پلیز سر....."

"پلیز پروفیسر سنا دیں نا!"

"سر رضا پلیز....."

بہت ساری منت بھری آوازیں گونجیں اور لڑکیوں نے دوپٹوں سے سر ڈھکنا شروع کر دیا تو وہ گہری سانس لے کر مائیک کے قریب ہوئے۔

میں بنا پلک جھپکے، ویران نگاہوں سے ان کا ہینڈسم چہرہ دیکھ رہی تھی۔ کوئی ملال، کوئی شرمندگی، کوئی احساسِ گناہ، کیا کچھ بھی تھا ادھر؟ وہ ذرا سا کھنکھار کر تسمیہ پڑھنے لگے۔

ان کی خوب صورت آواز کا سحر پورے ماحول پر چھانے لگا۔ بہت سی لڑکیوں کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔ ہر شخص اس سماں میں بندھ گیا تھا سوائے میرے..... میں بہت غور سے ان کا چہرہ کھوج رہی تھی۔ کہیں کوئی احساسِ گناہ رقم تھا یا نہیں؟ یا کیا واقعی انسان کے اعمال اس کی پیشانی پر نہیں لکھے جاتے؟

وہ اتنے ہی پُرسکون، نیک اور پارسا لگ رہے تھے جتنا پہلے لگتے تھے۔ یہی تو فرق ہے سحر اور معجزے میں۔ سحر صرف آنکھوں کا دھوکا ہوتا ہے اور میری آنکھیں اب دھوکے کی عادی ہو چکی تھیں۔

☆☆☆

فلزہ الجھ کر میرا چہرہ دیکھ رہی تھی۔

"اگر وہ میری منتوں ترلوں کے باوجود مجھ سے شادی پر راضی نہیں ہوئے تو اس طرح کیسے ہوں گے؟"

"تم کوشش تو کرو۔ تم خود ہی تو کہا کرتی تھیں کہ کبھی جا کر تم ان کی بیوی کو سب کچھ بتا دو گی۔"

"میں تو غصے میں کہتی تھی۔ بھلا ان کی بیوی میرا یقین کیوں کریں گی؟" وہ میری تجویز پر حیران تھی۔

ان کی بیوی تمہارا یقین کیوں نہیں کرے گی؟ یہ شک بھی رضا نے ڈالا ہے تمہارے ذہن میں۔ تم پر اعتماد ہو کر ان سے بات کرو۔ وہ اس دھمکی پر ضرور ڈریں گے۔" اسے کشمکش میں جتلا دیکھ کر میں اسے سمجھانے لگی۔ بہت دیر بعد اسے میری بات سمجھ میں آئی۔

"تمہارے نمبر سے کال اٹینڈ نہیں کر رہے تو تم میرے پی ٹی سی ایل سے کال کر لو۔" فون کا ریسیور کریڈل سے اٹھا کر میں نے اس کے ہاتھ میں تھمایا اور اسے الجھتا چھوڑ کر باہر چلی آئی۔

اماں گھر پر نہیں تھیں۔ میں برآمدے میں تنہا بیٹھ گئی۔ سامنے میز پر ایکسٹینشن دھرا تھا۔ چند لمحے میں سوچتی رہی پھر آہستہ سے ریسیور اٹھا لیا۔ میرے اندر موجود رضا حیات کی محبت میں ڈوبی لڑکی مسلسل فلزہ کو جھوٹا کہہ رہی تھی۔ شک کے باعث مجھ سے رہا نہ گیا اور میں نے سماعت ان کی گفتگو کی طرف لگا دی۔ غیر اخلاقی حرکت تو تھی مگر شاید اس سے کوئی فائدہ ہو جائے۔

وہ کہہ رہے تھے۔

"کس نمبر سے کال کر رہی ہو فلزہ۔"

"حلیمہ کے لینڈ لائن سے۔ میں آج کل اس کے پاس رہنے لگی ہوں۔" وہ چند ثانیے کو خاموش ہو گئے۔

"رضا! مجھ سے شادی کر لیں۔ ورنہ میں برباد ہو جاؤں گی۔" (تم برباد ہو چکی ہو فلزہ) میں نے دل میں سوچا تھا۔

"فلزہ کوئی تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔"

"آپ مجھ سے شادی کر لیں۔" وہ میری ہدایت کے مطابق کہہ رہی تھی۔

"ساری زندگی پڑی ہے شادی کے لیے۔ ابھی کوئی اور بات کرو۔"

"ٹھیک ہے اگر آپ مجھ سے شادی نہیں کریں گے تو میں آپ کی وائف کو سب کچھ بتا دوں گی، یہ بھی کہ میں آپ کے بچے کی....."

"تم ایسا کچھ نہیں کرو گی۔" وہ تیزی سے بولے۔

"پھر مجھ سے شادی کر لیں۔" وہ اصرار کر رہی تھی۔

رضا چند لمحے کچھ سوچتے رہے پھر دھیرے سے بولے۔

"تم نے حلیمہ کو تو کچھ نہیں بتایا؟"

"بے فکر رہیں..... آپ کے اس ڈارک سیکرٹ سے کوئی واقف نہیں۔" وہ تلخی سے بولی۔





"ٹھیک ہے، ہم کل شادی کر رہے ہیں، کل رات آٹھ بجے تم بلیو ایریا پہنچ جاؤ۔ وہاں مرسڈیز بنز کے شوروم کے سامنے سڑک کے کنارے کھڑی ہو جانا، میں تمہیں وہیں سے پک کر لوں گا۔ وہاں سے ہم میرے دوست کے گھر چلیں گے جہاں نکاح ہو گا، ٹھیک؟"

"ج..... جی۔" وہ گنگ سی ہو گئی۔

"لیکن اگر تم نے حلیمہ سمیت کسی کو بھی بتایا کہ کل رات تم مجھ سے ملنے آؤ گی تو شادی تو چھوڑو، میں تم سے بات بھی نہیں کروں گا۔"

"ٹھیک ہے۔" میں نے آہستہ سے ریسیور کریڈل پر رکھ دیا۔ دس منٹ بعد جب میں واپس کمرے میں آئی تو فلزہ کا چہرہ خوشی سے چمک رہا تھا۔

"وہ مجھ سے شادی کرے گا۔"

"کب؟"

"کچھ دن تک!" وہ مسکرا کر ٹال گئی اور میں اسے دیکھتی رہ گئی۔ وہ آج بھی رضا حیات کی داسی تھی۔ ان کے حکم پر آنکھیں بند کر کے عمل کرنے والی ان کے فرمان کے مطابق مجھ سے جھوٹ بولنے والی۔

☆☆☆

"مجھے خالہ کی طرف چھوڑ دینا، میرے پیرنٹس آ رہے ہیں۔ مجھے ان سے ملنا ہے۔"

اگلی شام جب میں نے اسے دانستہ بتایا کہ میں ماموں کی طرف جا رہی ہوں تو وہ فوراً بولی پھر تیار ہونے لگی۔

ہلکے گلابی رنگ کی شلوار قمیص کے اوپر اس نے گلابی شفون کا دوپٹا پھیلا کر لے لیا تھا۔ بال کھول کر دائیں شانے پر آگے کو ڈالے اور آنکھوں کو کاجل سے دہکایا۔ کانوں میں ننھے ننھے ٹاپس پہنے وہ بہت پیاری لگ رہی تھی۔

میں نے ٹیکسی میں اسے اس کی خالہ کے گھر کے

قریب مارکیٹ میں چھوڑا۔

"تم جاؤ، میں آگے خود چلی جاؤں گی۔" وہ اتر کر بولی تو میں نے سر ہلا دیا پھر میری ہدایت کے مطابق ٹیکسی والا ایک راؤنڈ لے کر واپس ادھر آیا تو قلزہ دور ایک اور ٹیکسی میں بیٹھ رہی تھی۔

میں نے پانچ سو کا نوٹ نکال کر ٹیکسی والے کی طرف بڑھایا۔

"اس لڑکی کا پیچھا کرو۔ یہ بلیو ایریا جا رہی ہے۔" کافی فاصلے سے اس کے تعاقب کے بعد میں فریسکو بیکری کے سامنے کھڑی تھی۔ جہاں میں تھی وہاں اندھیرا تھا۔ قلزہ مجھ سے دور مرسڈیز بنز کے شو روم کے سامنے منتظر کھڑی آتی جاتی گاڑیوں کو دیکھ رہی تھی۔ وہ مجھے نہیں دیکھ سکتی تھی مگر میں اسے بغور دیکھ رہی تھی۔

رات گہری ہو رہی تھی۔ میں نے گھڑی دیکھی آٹھ بج کر ایک منٹ تھا اور تبھی میں نے دور سے آتی کار کی ہیڈ لائٹس دیکھیں۔ وہ کار مخالف سمت سے بہت تیزی سے آرہی تھی۔ اس کی ہیڈ لائٹس آخری حد تک روشن تھیں۔ اس کی رفتار خطرناک حد تک تیز تھی۔

"قلزہ!" میرے لب پھڑپھڑائے، بے اختیار میں نے دل پر ہاتھ رکھا۔

تیز رفتار کار زن سے قلزہ کے قریب آئی۔ قلزہ اور میں نے ایک ساتھ ڈرائیور کا چہرہ دیکھا تھا اور وہ چہرہ دیکھ کر قلزہ کی آنکھوں کی جوت جل اٹھی تھی۔ وہ بے اختیار چند قدم آگے سڑک پر آئی۔

"نہیں...... قلزہ......" میں چیخنا چاہتی تھی مگر میری آواز حلق میں دم توڑ گئی۔ قلزہ اسی طرح سڑک پر آگے بڑھ رہی تھی۔ تیز رفتار کار قریباً اڑتی ہوئی عین سامنے آئی اور قلزہ کو ایک زوردار ٹکر مار کر آگے بڑھ گئی۔

ایک دل خراش چیخ کے ساتھ قلزہ لہرا کر نیچے گری۔ میں نے چلاتے ہوئے بھاگنا چاہا مگر بیساکھی گر گئی۔ میں خود اوندھے منہ زمین پر جا گری۔

دور قلزہ خون میں لت پت گری وحشیانہ انداز میں چلا رہی تھی اس کے ارد گرد لوگ اکٹھے ہونے لگے تھے۔ بہ مشکل اپنی بیساکھی، سنبھال کر میں لنگڑاتے ہوئے اس تک پہنچ پائی لوگوں کے ہجوم میں سے بہ وقت راستہ بنا کر میں نے دیکھا۔

اس کی آنکھیں کھلی تھیں۔ اس کا بے دم وجود خون میں نہایا تھا اور اس کی نگاہیں بے یقینی سے پھیلی ہوئی تھیں۔ ٹکر لگنے سے زیادہ وہ شاید اس آخری لمحے رضا حیات کے چہرے پر چھائی سفاکی کو دیکھ کر بے یقین ہوئی تھی۔

دور ایمبولینس کا سائرن بجنے لگا...... مگر میں جانتی تھی کہ اب دیر ہو چکی تھی۔ میرا ہیرا چکنا چور ہو چکا تھا۔

☆☆☆

قلزہ مر گئی اور اپنے پیچھے بہت سے آنسو چھوڑ گئی۔ رضا حیات کو اس کی موت کا کلاس میں پتا چلا تھا۔ وہ بے حد حیران اور ششدر رہ گئے تھے۔ انہوں نے وہیں دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے اور قرآن کی تلاوت کے بعد ایک رقت آمیز دعا کروائی۔ آخر میں ان کی اپنی آنکھیں بھیگ گئیں۔ پھر قلزہ کی موت کے تیسرے روز انہوں نے قلزہ کی یاد میں ایک پروگرام کا اہتمام کیا۔ اس پروگرام میں قلزہ کی ایک خوب صورت تصویر پیچھے اسٹیج پر آویزاں کی گئی اور قلزہ کے تمام جاننے والوں نے اس کے متعلق تاثرات بیان کیے۔

جب مجھے بلایا گیا تو میں نے ایک ویران نگاہ سب پر ڈال کر بس اتنا کہا۔

"قلزہ وہ ہیرا تھی جسے جوہری تراش نہ سکا۔ جوہری نے ایسی ضرب لگائی کہ وہ ٹوٹ کر چکنا چور ہو گیا۔ ہیرا سب سے سخت کوئلہ ہوتا ہے۔ اگر ٹوٹ جائے تو جڑ نہیں سکتا۔ وہ بھی ٹوٹ گئی تھی۔"

چند روز گزرے تھے کہ میں نے سنا، رضا حیات نے اپنا ٹرانسفر کروالیا ہے۔ وہ سندھ چلے گئے اور اپنے پیچھے اپنے چاہنے والوں کو اداس چھوڑ گئے۔

میں نہ تبھی پولیس اسٹیشن گئی۔ نہ ہی اس ہٹ اینڈ رن ایکسیڈنٹ کی تحقیقات کا مطالبہ کیا۔ قلزہ کے قاتل کو زیادہ سے زیادہ پھانسی مل جاتی؟ ایسے تو وہ اگلے جہاں اپنے گناہ سے بری ہو جاتے۔ میں نے اس کا معاملہ اللہ پر چھوڑ دیا۔ قتل ان کے نامۂ اعمال کا واحد گناہ نہیں تھا۔ سو ان کا معاملہ اللہ کے حوالے کرتے ہوئے میں نے یہ دعا کی تھی کہ اللہ ان کے ساتھ انصاف کرے اور انہیں شک کا فائدہ بھی نہ دے۔ یہ دنیا ابلیسوں کے لیے سزا کی جگہ نہیں ہے۔

☆☆☆

کلاس میں پن ڈراپ سائلنس تھا، سب دم بخود، سحر زدہ سے سر ہاشم آفندی کو سن رہے تھے۔ وہ ہمارے سائیکالوجی کے نئے پروفیسر تھے۔ ہینڈسم، اسمارٹ، جینئس، حاضر جواب اور مہربان۔ وہ سب کچھ تھے۔ کوئی منتر تھا ان کے پاس کہ چند ہی دنوں میں ساری کلاس ان کی طرف کھنچی چلی آئی تھی۔ ان کی گرویدہ ہو گئی تھی۔

"کتنے اچھے ہیں ناسر آفندی......" کلاس کے بعد جب میں اپنی کتابیں سمیٹ رہی تھی تو میری کلاس فیلو فاطمہ یوسف نے آہ بھر کر کہا تھا۔

"ہوں گے۔" میں نے فائل میں صفحے ترتیب سے لگاتے ہوئے سرسری سا کہا۔

"بہت کم لوگ ایسے ہوتے ہیں حلیمہ، اتنے نیک اور مہربان...... جانتی ہو ان کا تعلق علما کے خاندان سے ہے۔ بلکہ برصغیر میں اسلام کو متعارف ان کے پرکھوں نے ہی کروایا تھا۔"

"میں نے انسانوں سے متاثر ہونا چھوڑ دیا ہے فاطمہ۔ مجھے یہ سب مت بتاؤ۔ انسان وہ نہیں ہوتے جو دکھائی دیتے ہیں۔" میں بیگ اٹھا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ فاطمہ نے خفگی سے مجھے دیکھا۔

"سب مرد ایک سے نہیں ہوتے۔"

"ہاں، سب مرد ایک سے نہیں ہوتے مگر فارمولا سب پہ ایک ہی اپلائی ہوتا ہے۔ جو محرم ہے، وہ مرد آپ کے لیے اچھا ہے اور جو محرم نہیں ہے، وہ چاہے آپ کو جس رشتے سے بھی پکارے، وہ آپ کے لیے اچھا نہیں ہو سکتا۔ جو محرم نہیں، اس سے تنہائی میں ملنے کی اجازت میرے رب نے نہیں دی۔ چاہے وہ تنہائی ٹیلی فون تک گفتگو تک ہو یا کسی پروفیسر کے آفس میں جا کر اس سے ملنے کی حد تک۔ سب مرد ایک سے نہیں ہوتے فاطمہ مگر فارمولا سب پہ ایک ہی اپلائی ہوتا ہے۔" ایک تلخ مسکراہٹ کے ساتھ کہہ کر میں پلٹ گئی۔ میری بیساکھی کی ٹک ٹک خالی کلاس روم میں گونجنے لگی۔ میں لنگڑاتے ہوئے دروازے کی طرف بڑھنے لگی۔

میں جانتی ہوں کہ پیچھے بینچ پر بیٹھی فاطمہ کو میری بات سمجھ میں نہیں آئی مگر شاید آپ کو آ گئی ہو۔ مجھے قدرت کا یہ اصول اس وقت سمجھ آیا تھا جب میں قلزہ کو کھو چکی تھی۔ ہاں میرا مددگار...... مجازی خدا رضا حیات تھا۔ وہ جس کے صرف خیال نے ہی مجھے باندھ رکھا تھا۔ مجھے اللہ سے دور کر دیا تھا۔

میں نے اس سونے کے بچھڑے کو توڑ کر جلا کر نیل کے پانیوں میں بہا دیا ہے اور اب میں آپ سے پوچھنا چاہتی ہوں کہ کیا آپ کا بھی کوئی ایسا جھوٹا خدا ہے جس نے آپ کو باندھ رکھا ہے اور آپ کو اللہ سے دور کر دیا ہے؟ اگر ہے تو اسے ابھی توڑ ڈالیں۔ نصیحت پھر بعد میں آپ کے پاس نہیں آئے گی...... بعد میں صرف عذاب آتا ہے۔